تعلیم و تربیت
مئی 2015ء
ٹیپو سلطان
ماں کی عظمت
صفحہ نمبر 08

تعلیم و تربیت

مئی 2016

اس شمارے میں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

مونا لیزا کا خالق لیونارڈو ڈونچی ایک عجیب انسان تھا۔ وہ بہترین مصور، شان دار موسیقار اور اعلیٰ پائے کا سائنس دان تھا۔ وہ دن رات آرٹ گیلری میں کام کرتا۔ جب تھک جاتا، برش پر قابو نہ رہتا تو وہ آرٹ گیلری سے نکل کر اسٹوڈیو کی طرف چل پڑتا جہاں وہ گٹار، ہارمونیم اور ڈرم بجانا شروع کر دیتا۔ وہ موسیقی کی دھنوں کے رنگ بکھیرتا ہوا سارے اسٹوڈیو کو مہکا دیتا۔ اس کا یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہتا۔ اگر یہاں اس کی دھنیں کمزور پڑ جاتیں، ساز اور آواز کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تو وہ موسیقی کے آلات کو دور پھینکتا اور لیبارٹری کا رُخ کر لیتا جہاں نت نئے تجربات اس کے منتظر ہوتے۔ وہ اپنی آنکھیں نیلے اور سرخ لٹمس پیپرز، اوزان کے چھوٹے بڑے آلات اور کیمیائی مادوں کے خواص کی شیٹ پر مرکوز کر دیتا۔ وہ مشاہدات کرتا، تخمینے لگاتا اور کیمیائی عمل کے نتائج کے نوٹس بناتا رہتا۔ اگر یہاں بھی یہ عمل اپنی دلچسپی کھو دیتا، اس کی آنکھیں بوجھل ہو جاتیں، جسم تھکاوٹ کا شکار ہو جاتا تو وہ دوبارہ برش پر قابو پانے کے لیے واپس آرٹ گیلری میں لوٹ آتا۔

لیونارڈو ڈونچی کو قدرت نے تین مختلف شعبوں میں یکساں مقبولیت کے علاوہ ایک اور صلاحیت سے نوازا تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں ہاتھوں سے کام کرنے کی مہارت رکھتا تھا۔ وہ بڑی خوبی کے ساتھ دائیں بائیں ہاتھ سے پینٹ کر سکتا تھا۔ اُلٹے سیدھے ہاتھ سے گٹار بجا سکتا تھا اور دونوں ہاتھوں سے لکھ سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کر اس میں یہ خوبی تھی کہ وہ دُنیا کا واحد شخص تھا جو ایک ہی وقت میں ایک ہاتھ سے تصویر اور دوسرے سے گھڑی ٹھیک کر سکتا تھا، جو ایک ہاتھ سے گھڑی ٹھیک کر سکتا تھا اور دوسرے سے کوئی بھی آلۂ موسیقی بجا سکتا تھا لیکن اس طرح کہ گھڑی کے پرزوں کا توازن بگڑے، نہ رنگوں کی انفرادیت مجروح ہو اور نہ ہی سُروں کا حسن متاثر ہو۔ کبھی کبھار تو ایسے بھی ہوا کہ ڈونچی نے اپنے سامنے دو ایزل لگائے، ایک پر ایک ہاتھ سے کسی کی پورٹریٹ شروع کی اور دوسرے ہاتھ سے کوئی لینڈ اسکیپ پینٹ کرنے لگا۔ جب انہیں مکمل کیا تو دونوں زبردست ہوتی تھیں۔

ستم ظریفی سے ایک دن ڈونچی جب صبح اُٹھا تو اس کے دونوں بازو کندھوں سے انگلیوں تک مفلوج ہو چکے تھے اور ایک عبرت انگیز زندگی اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اسی عالم میں وہ گھنٹوں آرٹ گیلری میں بے کار بیٹھا رہتا۔ وہ ایزل پر چڑھی ہوئی ادھوری تصویریں، رنگوں سے بھرے ہوئے برش اور نامکمل اسکیچز پر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا۔ جب یہاں دکھ برداشت سے باہر ہوتا تو وہ اُٹھ کر اسٹوڈیو آ جاتا جہاں پیانو، گٹار اور ڈرم اسے منہ چڑا رہے ہوتے۔ جب یہاں بھی اسے چین نہ ملتا تو وہ لیبارٹری میں چلا جاتا جہاں سٹینڈوں پر چڑھی ٹیوبیں اس کا مذاق اُڑاتیں۔ مشاہدات، نتائج کے نوٹس اس کی بے وقعتی کا قصیدہ پڑھتے اور اس الجھے پر مسکراتے۔ یہاں اس کی برداشت جواب دے جاتی اور وہ بچوں کی طرح زار و قطار رونا شروع کر دیتا۔ وہ اتنا روتا کہ اس کی گھنی سیاہ داڑھی گیلے تولیے کی طرح آنسوؤں سے بھاری ہو جاتی۔

کسی نے ڈونچی سے پوچھا: "اگر ایک لمحے کے لیے تمہارے بازو زندہ ہو جائیں تو کیا کرو گے؟" اس نے فوراً جواب دیا: "میں اپنے آپ کو چھو کر دیکھوں گا۔" آخری وقت میں کسی نے اس سے کہا: "ڈونچی آپ کی کوئی خواہش؟" اس نے پوچھنے والے کو حیرت سے دیکھا اور مسکرا دیا، پھر آنکھیں موند کر نقاہت سے بولا: "کاش ڈونچی اپنے ہاتھ سے ناک پر بیٹھی مکھی اُڑا سکتا۔ کاش اے کاش!"

پیارے بچو! آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت سے انسان کیا کچھ کر سکتا ہے لیکن وہ قدرت چاہے تو کسی چیز کو بے جان بھی کر سکتی ہے، لہٰذا ہمیں ان باتوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ انسان بے بس، ناچیز ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو زمین پر سوکھی گھاس میں بھی جان ڈال کر سرسبز و شاداب کر دیتا ہے۔

28 مئی کا دن ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب چاغی کے مقام پر 5 ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان نے پہلی اسلامی ایٹمی قوت کی حامل مملکت بننے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس شمارے میں یوم مزدور اور مدر ڈے کے حوالے سے بھی تحریریں حاضر ہیں۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 850 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
ایشیاء، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 30 روپے

حمد باری تعالیٰ

ترے سوا اے خدائے واحد کسی کے آگے نہ سر جھکاؤں
ترے ہی دَر سے مراد مانگوں تجھی کو میں حالِ دل سناؤں

فضائیں معمور میرے دم سے ہوں عالم حق و راستی کی
وہ زورِ بازو مجھے عطا کر کہ قصرِ باطل کے سب گراؤں

نظامِ عالم تہِ سپہرِ کہن سرا سر بگڑ چکا ہے
تری نوازش جو دے اجازت تو اپنی دُنیا نئی بساؤں

تڑپ رہا ہوں میں تشنگی سے جہانِ بے مہر و کینہ خو میں
پلا مجھے بادۂ محبت کہ دل سے نقشِ دُوئی مٹاؤں

مجاز و باطل کے بتکدوں کو جلا دوں سوزِ فغانِ دل سے
صدائے پُر درد سے جہانِ عمل کو میں خواب سے جگاؤں

آپ ﷺ نے فرمایا

فرمایا تم مسلم سارے آپس میں بھائی ہو
مل جل کر رہو الفت سے سدا منظور جو اپنی بھلائی ہو

فرمایا دُور کرو سب فکریں تم آفت کے ماروں کی
معذوروں کی مجبوروں کی، بیماروں کی بے چاروں کی

فرمایا تم امداد کرو مظلوموں کی ہتھیاروں سے
دیکھو دُنیا میں ظلم نہ ہو، ان نیزوں اور تلواروں سے

فرمایا جب تک قوم کوئی خود آپ درست نہیں ہوتی
تقدیرِ الٰہی بھی اس کی امداد پہ چُست نہیں ہوتی

وہ ماہِ عرب ہی اے نیّر اپنا تو جہاں میں سہارا ہے
ہو جائیں فدا اس نام پہ ہم یہ نام ہی ایسا پیارا ہے

خالد بزمی

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں سے کبھی ایسی باتیں ظاہر کرا دیتا ہے جن کے کرنے سے دُنیا کے دوسرے لوگ عاجز ہوتے ہیں تاکہ لوگ ایسی باتوں کو دیکھ کر سمجھ لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں، ایسی باتوں کو معجزہ کہتے ہیں۔ معجزات صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت ہی سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ معراج شریف کا واقعہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم معجزات میں سے ہے۔ یہ واقعہ ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں پیش آیا۔

قرآنِ کریم کے پندرہویں پارہ کی ابتداء میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

”پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گئی جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں نازل کی ہیں تاکہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، بے شک وہ ہر بات سننے والا، ہر چیز دیکھنے والا ہے۔“ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت:1)

اس واقعہ کی پوری تفصیل تو احادیث اور سیرت کی کتابوں میں درج ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور رات کے وقت آپؐ کو ایک جانور پر سوار کیا جس کا نام بُراق تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آپؐ کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا۔ مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) مکہ مکرمہ میں ہے اور مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) فلسطین کے شہر القدس میں ہے۔ جس کا پُرانا نام ایلیا ہے۔ یہ سفرِ معراج کا پہلا مرحلہ تھا جسے اسراء کہتے ہیں۔ پھر وہاں سے حضرت جبرائیل علیہ السلام آپؐ کو ساتوں آسمانوں پر لے گئے۔ ہر آسمان پر آپؐ کی ملاقات پچھلے پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر سے ہوئی اور آپؐ کو عالم بالا کی سیر کروائی گئی۔ آپؐ کو براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اُمت کے لیے پانچ نمازوں کا تحفہ عطا فرمایا۔ مسجدِ اقصیٰ سے آسمانوں تک جانا اور عالم بالا کی سیر فرمانا یہ سفر کا دوسرا مرحلہ تھا جسے معراج کہتے ہیں، جس کا کچھ ذکر سورۂ نجم میں ہے اور دیگر تفصیلات احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ یہ آنا جانا سب حالتِ بیداری کا واقعہ ہے۔ آپؐ واقعتاً روح اور بدن سمیت پہلے بیت المقدس اور پھر وہاں سے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ پھر رات ہی رات آپؐ واپس بھی تشریف لے آئے۔

احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں۔ جب آپؐ کا واپسی پر حضرت موسیٰؑ کے پاس سے گزر ہوا اور ان کو معلوم ہوا کہ آپؐ کی اُمت پر پچاس نمازیں فرض ہوئی ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ میں لوگوں کو زیادہ جانتا ہوں۔ میں نے اپنی اُمت بنی اسرائیل کے ساتھ بہت محنت کی ہے مگر وہ لوگ فرض نمازوں کا اہتمام نہ کر سکے۔ بلاشبہ آپؐ کی اُمت بھی اتنی نمازیں پڑھنے کی طاقت نہ رکھے گی، اس لیے آپؐ اپنے رب کے پاس جایئے اور تخفیف کا سوال کیجیے۔ یوں حضرت موسیٰؑ کے توجہ دلانے پر اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار درخواست کرنے پر نمازیں پانچ رہ گئیں۔ اب جو حضرت موسیٰؑ کے پاس گزر ہوا تو انہوں نے مزید تخفیف کروانے کا کہا مگر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”میں نے اپنے رب سے یہاں تک سوال کیا کہ اب مجھے شرم آتی ہے، اب تو میں اسی پر راضی ہوتا ہوں اور اس کو تسلیم کرتا ہوں۔“ اس پر رب کریم نے وعدہ فرمایا کہ پانچ نمازیں پڑھنے پر بھی میں پچاس نمازوں کا ثواب عطا کروں گا۔

نماز، معراج کا خاص تحفہ ہے کیوں کہ دیگر عبادتیں اسی سرزمین پر رہتے ہوئے فرض کی گئیں لیکن نماز عالم بالا میں فرض کی گئی۔

اگر ہم دن بھر میں پانچ نمازیں پابندی کے ساتھ مقررہ وقت پر توجہ اور عاجزی کے ساتھ ادا کریں تو تب ہم اس تحفہ کی قدر کرنے والے ہوں گے۔ بچو! آپ اس کا اہتمام کریں گے ناں! ☆☆

مکافات

علی اکمل تصور

بازار سے ملحق ایک گلی کے کونے پر عثمان کی دُکان تھی۔ اس دُکان کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں صرف اور صرف بچے خریداری کر سکتے تھے۔ عثمان کو بچوں سے بہت محبت تھی، اس لیے اس نے کام بھی ایسا ہی شروع کیا تھا جو بچوں کے اردگرد ہی گھومتا تھا۔ یہاں بچوں کے کھانے پینے کی تمام اشیاء موجود تھیں۔ مختلف انواع واقسام کی سوئیٹس، جیلیز، کھٹے میٹھے پاپڑ اور پھلوں کے جوس وغیرہ۔ اس نے اپنی دُکان کا سیٹ اپ ایسا بنایا تھا کہ بچے اپنی پسند کی چیزوں کا انتخاب خود کرتے تھے۔ لکڑی کے تختوں پر تمام اشیاء طریقے اور سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ دُکان میں عثمان کے ذمے صرف دو کام تھے۔ ایک تو بچوں سے چیزوں کی قیمت وصول کرنا اور دوسرے جو ڈبہ خالی ہو جاتا، وہ اسے پھر سے بھر دیتا۔ سارا دن رونق تو لگی ہی رہتی تھی لیکن اصل میلہ اسکول سے چھٹی کے وقت لگتا تھا۔ عثمان کے لیے بچوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس دھینگا مشتی میں چند نکھے بچے چیزیں اڑا بھی لیتے تھے۔ عثمان کو سب خبر ہوتی تھی۔ اللہ نے اسے سخی دل عطا کیا تھا۔ بچوں کی خوشی اور مسکراہٹ میں اسے روح کا سکون ملتا تھا۔ وہ ایسے بچوں کو بعد میں سمجھاتا ضرور تھا لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ چور چوری سے تو جائے پر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔

ایک صبح عثمان نیند سے جاگا تو اس کی طبیعت خراب تھی لیکن پھر بھی وقت پر وہ اپنی دُکان پر چلا آیا۔ اسے اسکول جانے والے بچوں کو خوش آمدید کہنا تھا۔ پھر صبح کے دس بج گئے۔ اب عثمان کو اپنا بلڈ پریشر چیک کروانے کے لیے ڈاکٹر کے کلینک پر جانا تھا۔ کلینک پاس ہی تھا۔ پانچ منٹ کے لیے دُکان کو پھر سے سمیٹ دینا، عثمان نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے اس نے ساتھ موجود حافظ صاحب کو آواز دی۔ وہ یہاں چائے کا ہوٹل چلاتا تھا۔

"حافظ صاحب...... میں ذرا ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں، دُکان کا خیال رکھیے گا۔" چائے والے نے دُکان کی ذمہ داری لے لی تھی۔ اب عثمان ڈاکٹر کے پاس آیا۔ اس کا بلڈ پریشر ہائی تھا۔ اسی وجہ سے سر میں درد تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دوا دی اور عثمان پھر سے اپنی دُکان پر چلا آیا۔ یہاں ایک عجیب منظر عثمان کا منتظر تھا۔ ایک چار سال کا چھوٹا سا بچہ جانے کیسے چائے والے کی نظروں سے بچ کر دُکان میں گھس آیا تھا اور اب وہ ڈبوں میں موجود چیزیں اُٹھا اُٹھا کر اپنی جیبوں میں ٹھونس رہا تھا۔ اس کا سارا دھیان چوری کرنے پر لگا ہوا تھا۔ عثمان اتنے چھوٹے سے بچے کو ایسی کارروائی کرتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑا۔ پھر اسے شرارت سوجھی۔ وہ چپکے سے بچے کے قریب پہنچا اور پھر اس کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔

"پکڑ لیا......!" عثمان کی آواز میں جوش تھا۔ اچانک آنے

والی مصیبت کا احساس کر کے وہ بچہ بہت گھبرا گیا تھا۔ اب وہ فضا میں معلق تھا۔ پھر عثمان نے دیکھا، اس بچے کی پتلون کے پائنچوں میں سے پانی کے قطرے نیچے گرنے لگے تھے۔ خوف سے بچے کا شو...... شونکل گیا تھا۔

''اے...... ہائے...... گندہ بچہ!'' عثمان نے بچے کو چھوڑ دیا۔ وہ بچہ اب طوفان کی رفتار سے بھاگ نکلا تھا اور عثمان بس ہنسے جا رہا تھا۔ پھر پندرہ منٹ گزر گئے۔ عثمان نے اسی بچے کو دوبارہ دیکھا تھا لیکن اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ابو بھی تھا۔ اس نے اپنی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ آنکھوں میں خون کی لالی موجود تھی۔ جسمانی ساخت اور چہرے کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ ایک سخت گیر آدمی ہے۔ عثمان ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ اسے تو پہلے ہی سر درد تھا۔ اب دردِ سر اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ عثمان کے قریب پہنچ کر وہ آدمی بدتمیزی سے بولا:

''تم نے میرے بچے کو کیوں مارا اور اس سے اس کے پیسے بھی چھین لیے......'' یہ الزام سن کر عثمان کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔

''یہ جھوٹ ہے۔ مجھے بھلا کیا ضرورت ہے بچے کو مارنے کی...... بلکہ یہ بچہ تو میری دُکان سے چیزیں چرا رہا تھا۔''

''تمہاری موجودگی میں تمہاری دُکان سے چیزیں چرا رہا تھا؟'' اس آدمی کا لہجہ ترش اور سوالیہ تھا۔

''نہیں...... میں دُکان پر موجود نہیں تھا۔ اس بچے نے میری غیر موجودگی میں واردات کی ہے۔'' عثمان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس غصیلے آدمی سے کیا کہے۔ اب اس آدمی نے عثمان کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

''میرا بچہ روتے ہوئے گھر پہنچا ہے۔ ٹھیک ہے میں یہاں مہمان ہوں...... اجنبی ہوں، لیکن دو منٹ میں تمہیں زمین کی دھول چٹا سکتا ہوں۔'' اس آدمی نے اپنے ہاتھ کا گھونسا بنا لیا تھا۔ اب عثمان نفسیاتی طور پر سنبھل چکا تھا۔

''یہ غلط بات ہے...... یہ زیادتی ہے۔ آپ ایک بچے کی بات پر بھروسا کر رہے ہیں اور میری بات پر کوئی بھروسا نہیں...... میں سچ کہتا ہوں۔ یہ بچہ میرے بچوں جیسا ہے، میں نے اس کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا۔''

''تو پھر یہ رویا کیوں؟'' اتنا کہہ کر اس آدمی نے عثمان کو ایک گھونسا جڑ دیا۔ عثمان نے وار بچا لیا تھا لیکن اب اس کا بھی دماغ خراب ہونے لگا۔ شور وغل سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ عثمان کو اپنی بات کہنے کے لیے حوصلہ مل گیا تھا۔

''ایک تو آپ کے بچے نے چوری کی ہے، دوسرے آپ ہیں کہ سینہ زوری کر رہے ہیں۔ بچے بڑوں سے سیکھتے ہیں۔ آپ اپنے بچے کو کیا سکھانا چاہ رہے ہیں۔ اگر تو آپ کی نظر میں چوری کرنا اچھی بات ہے تو پھر اپنے بچے کا ساتھ دیجیے اور اگر چوری کرنا غلط عادت ہے تو پھر آپ مجھ سے جھگڑا کرنے کیوں آئے ہیں۔ جائیے یہاں سے اور اپنے دماغ کا علاج کرائیے۔'' عثمان کی بات سن کر اس آدمی کا پارہ اور چڑھ گیا لیکن وہ یہ بات محسوس کر رہا تھا کہ بازار کے تمام لوگ عثمان کے ساتھ ہیں۔

''میں اپنے دماغ کا علاج کراؤں گا اور یاد رکھنا...... میں دوبارہ لوٹ کے آؤں گا...... میں ضرور آؤں گا اور تمہیں مزہ چکھا کر ہی رہوں گا۔'' وہ آدمی اپنے بچے کے ہمراہ عثمان کو دھمکیاں دیتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ عثمان یوں جیسے بہت تھکا ہارا ہو اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند لمحے پہلے آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ بازار کے لوگ بھی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان سب کو عثمان کی سچائی پر بھروسا تھا کیوں کہ وہ سب عثمان کے اخلاق اور رویے سے واقف تھے لیکن اب وہ سب اس اجنبی کو بھی فراموش نہیں کر سکتے تھے جو عثمان کو دھمکی دے کر گیا تھا۔ اس کا غصہ بتا رہا تھا کہ وہ عثمان سے اس کے کسی ناکردہ قصور کا انتقام لینے کے لیے ضرور آئے گا۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔

اس آدمی کا نام کاشف تھا۔ وہ یہاں اپنے عزیزوں سے ملنے آیا تھا اور پھر بچے کی وجہ سے اس کا عثمان کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ اسی شام وہ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ واپس اپنے شہر لوٹ گیا تھا لیکن عثمان کا چہرہ اس کی آنکھوں میں نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ عثمان کی آواز اس کے کانوں میں زہر گھولتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ بچے اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں۔ اگر میرے بچے نے چوری کی ہے تو کیا میں بھی چور ہوں۔ اس نے میرے بچے کو ہی نہیں مجھے بھی چور کہا ہے۔ میں اس سے انتقام ضرور لوں گا۔ اگر دیکھا جائے تو کاشف احمق تھا۔ وہ جوش میں ہوش کھونے والا آدمی تھا۔ بات کو سمجھنے کے انداز ضرور الگ الگ ہو سکتے ہیں، عثمان کی ایک مثبت بات کو اس نے منفی انداز میں سمجھا تھا اور اب وہ اس سے انتقام لینے کے

طریقوں پر غور کر رہا تھا۔

وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا تھا۔ یہاں موٹر سائیکلیں تیار کی جاتی تھیں۔ اس کے پاس کوئی بڑا عہدہ نہیں تھا۔ وہ تو یہاں بس مزدوری کرتا تھا۔ لوہے کے پرزوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اس کا دل بھی اب بس زنگ لگے لوہے کا پرزہ بن کر رہ گیا تھا۔

اس دن وہ فیکٹری پہنچا تو اسے ہر طرف اک ہل چل کے آثار نظر آئے۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ فیکٹری کے مالکان اچانک فیکٹری کا دورہ کرنے آ رہے ہیں۔ وہ بھی ہوشیار ہو گیا۔ ایک ہی وقت میں اس میں دو صفات موجود تھیں۔ یا تو وہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کرتا تھا یا پھر ضرورت سے زیادہ بے وقوف بن جاتا تھا۔ آج ہوشیار بننے کی باری تھی۔ پھر فیکٹری کے احاطے میں ایک کار آ کر رکی۔ دو صاحبان نیچے اُترے تھے اور پھر کاشف ان کی جی حضوری میں لگ گیا تھا۔ وہ کتے کی مانند ان کے پیچھے دُم ہلاتا پھر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہ مالکان خوش ہو گئے تو نوکری کے حوالے سے اس کی ترقی ہو جائے گی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والے لمحات میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کاشف ان صاحبان کے پیچھے پیچھے تھا۔ ایک بہت کم ہجوم والی جگہ پر ایک صاحب کو چھینک آئی۔ اس نے منہ صاف کرنے کے لیے رومال نکالا تو کاشف کا دل اُچھل کر رہ گیا۔ اس صاحب کا کسی راشی آفیسر کے پیٹ کی مانند پھولا ہوا پرس نیچے گر پڑا تھا۔ بے خیالی میں سب آگے نکل گئے تھے۔ کاشف کے اندر کا بے ایمان آدمی کروٹ لے کر بیدار ہو گیا تھا۔ کاشف نے جھپٹ کر پرس اُٹھایا اور اپنے لباس کی اندر والی جیب میں رکھ لیا تھا۔

عثمان نے درست کہا تھا۔ ''بچے بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں۔'' کاشف کی تربیت نے اس کے اپنے معصوم بچے کو بھی چور بنا ڈالا تھا۔ اب کاشف بہت خوش تھا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ ایک بہت بڑی رقم اس کے ہاتھ لگی ہے لیکن پھر اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ تمام ورکرز کو ایک بڑے ہال میں جمع کر لیا گیا تھا۔ کاشف قدرے دیر سے ہال میں پہنچا تھا۔

''ماجرا کیا ہے؟'' اس نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''ہم میں سے کسی نے بڑے صاحب کی جیب پر ہاتھ صاف کر ڈالا ہے۔ صاحب کا پرس غائب ہے اور اب یہاں سب کی تلاشی لی جائے گی۔'' یہ بات سن کر کاشف کو تو چکر آ گیا۔ آنکھوں کے سامنے موجود سارا منظر گھوم گیا تھا۔ اس نے چوری نہیں کی تھی لیکن چوری کی ایک قسم کو اختیار ضرور کیا تھا۔ اگر اس کے پاس سے پرس برآمد ہو جاتا تو نوکری بھی جاتی اور حوالات کی ہوا بھی کھانا پڑتی۔ اب اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے اسی راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا۔

''بڑے صاحب...... بڑے صاحب! آپ کا پرس میرے پاس ہے۔ یہ مجھے وہاں راہداری میں پڑا ملا تھا۔'' کاشف ورکرز کے ہجوم میں سے باہر نکل آیا اور اب وہ سچ بول رہا تھا۔ بڑے صاحب نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر چلّا کر بولا:

''پکڑ لو اس چور کو، پکڑے جانے کے ڈر سے جھوٹ بول رہا ہے۔'' سیکیورٹی پر مامور افراد نے کاشف کو دبوچ لیا۔ کسی نے سچ کہا ہے، یہ دُنیا مکافاتِ عمل کا میدان ہے۔ زمین کا حساب زمین

پر ہی ہوتا ہے۔ دوزخ بھی یہی ہے، جنت بھی یہی ہے۔

پہلے تو چوری کے الزام میں کاشف کی اچھی طرح پٹائی کی گئی، پھر اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ نوکری سے بھی جواب ہو گیا اور تین ماہ قید کی سزا بھی ہو گئی۔ تین ماہ کی اس قید کے شب و روز میں کاشف کے ذہن میں صرف ایک ہی سوال گردش کرتا تھا۔

''میرے ساتھ ہی ایسے کیوں ہوا؟'' پھر اس کی آنکھوں میں عثمان کا چہرہ اُتر آتا۔ اس کا عثمان کا گریبان پکڑنا، گھونسا مارنا، بدتمیزی کرنا، دھمکی دینا آنکھوں میں گردش کرنے لگا۔ اب کاشف کو احساس ہونے لگا کہ عثمان کی باتیں درست تھیں۔ بچے بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں۔ میرا راستہ غلط تھا تو میں ذلیل ہوا۔ میرے بچے کا بھی وہی راستہ تھا جو میرا راستہ تھا۔ پھر بھی عثمان نے میرے بچے کے ساتھ پیار والا برتاؤ کیا تھا۔ میں اپنی جھوٹی اکڑ میں اس سے جھگڑنے چلا گیا تھا۔ یہ انسان کی فطرت ہے جب وہ اچھا بننے پر آتا ہے تو بہت ہی اچھا بن جاتا ہے۔ پھر وہ دن آ پہنچا جب کاشف کو جیل کی قید سے رہائی ملنے والی تھی۔ اس کے خاندان کے تمام لوگ جیل کے باہر کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر وہ آیا، سب سے ملا۔ سب سے اپنی گستاخیوں کی معافی مانگی۔ اس کی بدلی ہوئی ذہنی کیفیت دیکھ کر سب خوش ہو گئے تھے۔

''چلو اب گھر واپس لوٹ چلتے ہیں۔'' سب ہی اس سے کہہ رہے تھے لیکن وہ رُک گیا۔ اس نے اپنا بچہ گود میں اُٹھا لیا تھا۔

''ابھی ایک کام ادھورا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اک انجانی منزل کی طرف قدم اُٹھانے لگا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے کاشف کا ارادہ کیا ہے۔ وہ تو بس اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اس کی گود میں موجود بچہ ہاتھ ہلا ہلا کر سب کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ اسکول کے بچوں کو چھٹی ہونے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا۔ عثمان اپنی دُکان پر بیٹھا اکا دکا گاہکوں کو فارغ کر رہا تھا کہ ایک شور سا بلند ہوا۔

''وہ آ گیا...... وہ آ گیا۔'' شور سن کر ایک لمحے کے لیے عثمان گھبرایا، پھر اس نے دُکان سے باہر نکل کر کسی سے پوچھا۔

''کون آ گیا......؟''

''وہی جس کے ساتھ تمہارا جھگڑا ہوا تھا۔ تم دُکان چھوڑ کر بھاگ جاؤ، ہم اسے دیکھ لیں گے۔'' بازار کے چند دُکان دار اس کے پاس گلی میں آ گئے تھے اور اسے فرار ہونے کا مشورہ دے رہے تھے۔

''میں بزدل نہیں ہوں۔'' اتنا کہہ کر عثمان کاؤنٹر کے پیچھے اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کاشف کو آتے ہوئے دیکھا۔ بچہ اس کی گود میں تھا۔ عثمان سمجھ گیا تھا کہ آج کاشف جھگڑا کرنے نہیں آیا۔ ''پھر وہ کیوں آیا ہے؟'' اب عثمان اس نکتے پر سوچنے لگا تھا۔ بازار کے اتحادیوں کا ایک ہجوم کاشف کے پیچھے تھا۔ آنے والے کے ارادے سے کوئی آگاہ نہیں تھا۔ ان سب کو عثمان کی حفاظت کا خیال تھا۔ پھر کاشف دُکان کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ اس نے بچے کو گود میں سے اُتار دیا۔ بچے کو کچھ یاد نہیں تھا، وہ تو مزے مزے کی چیزیں دیکھ کر مچل گیا تھا۔ اس نے اپنی پسندیدہ چیزیں اُٹھا لیں تھی۔ اب کاشف بولا: ''کتنے پیسے ہوئے۔''

''پچپن روپے۔'' عثمان نے بس مطلب کی بات کی تھی۔

کاشف نے قیمت ادا کر دی تھی، پھر اس نے بچے کو اُٹھا لیا اور واپس جانے کے لیے مڑا، پھر سر گھما کر بولا:

''یار اب تو معاف کر دو۔'' یہ کہتے کہتے کاشف سسک پڑا تھا۔ اس جملے میں جانے کیا بات تھی۔ عثمان دوڑ کر کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا اور کاشف سے لپٹ گیا۔ سب مسکرانے لگے۔ آج ایک بے نام دشمنی کا خاتمہ ہوا اور ایک انوکھی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ یہ بہت خوشی کی بات تھی۔ ☆☆☆

باپ کی نصیحت

ایک آدمی نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کے لیے اسے ایک شیشے کے سامنے کھڑا کر کے پوچھا: ''بیٹا! اس شیشے میں تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟'' بیٹے نے جواب دیا: ''ابا جان! دوسری طرف لوگ نظر آ رہے ہیں۔'' پھر باپ نے اسے ایک آئینے کے سامنے کھڑا کیا اور پوچھا: ''اب کیا نظر آ رہا ہے؟'' بیٹے نے جواب دیا: ''ابا جان! اب مجھے اپنا چہرہ نظر آ رہا ہے۔'' باپ نے کہا: ''دیکھو بیٹے، یہ دونوں ہی شیشے ہیں ایک پر چاندی کا ملمع چڑھایا گیا ہے تو اس میں تمہیں اپنا آپ نظر آ رہا ہے اور دوسرے پر کچھ نہیں چڑھایا تو اس میں تمہیں دوسری طرف لوگ نظر آ رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح اگر تم صرف شیشہ بن کر رہو گے تو تمہیں دوسرے لوگ نظر آتے رہیں گے لیکن اگر تم اپنے آپ پر سونے چاندی کا ملمع چڑھا لو گے اور آئینہ بن جاؤ گے تو تمہیں لوگ نظر آنا بند ہو جائیں گے اور صرف اپنا آپ ہی نظر آئے گا۔ اپنا آپ نظر آنے سے انسان میں تکبر بڑھتا ہے، اس لیے ہمیشہ شیشہ بن کر رہنا تاکہ دوسرے لوگوں کے دکھ درد، غم اور تکلیفیں تمہیں نظر آتی رہیں۔''

کائنات کے سارے رنگ اکٹھے کر لیے جائیں اور کوشش کی جائے کہ ان سے ماں کی صحیح تصویر کھینچ لی جائے تو رنگوں کا دامن خالی نظر آنے لگے گا۔ شیریں پھلوں کی شیرینی، سارے جذبوں کی گرمی، سورج کی روشنی اور اس دُنیا کا سارا حسن ماں کی ہلکی سی مسکراہٹ کے آگے ہیچ نظر آتا ہے۔

ماں جس کے قدموں تلے جنت ہے، ماں جس کی خدمت کو نبی کریم ﷺ نے جہاد سے افضل قرار دیا اور جس کی دعائیں ہر وقت اولاد کو گھیرے رہتی ہیں، اس عظیم ہستی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے مدر ڈے کے حوالے سے عقیدت بھرے الفاظ حاضر ہیں۔

انسان جوں ہی کائنات ارضی میں اپنی آنکھ کھولتا ہے تو اس میں بولنے کی قوت ہوتی ہے، نہ سمجھنے کی۔ نہ چلنے کی ہمت، نہ سونگھنے کی صلاحیت گویا ماں کی ممتا کے سائے تلے حواسِ خمسہ کو استعمال میں لانے کے لیے ہر انسان کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوا کرتی ہے۔ بنی نوع انسان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دُنیا کے مشہور زمانہ سپوتوں کی کام یابی، بلند ہمتی اور بلند حوصلگی کے پسِ پردہ ماں کی تربیت اور پاکیزہ پرورش کا عمل کارفرما ہوتا ہے۔ اسی لیے نوجوان شاعر وصی شاہ نے کہا۔

یہ کامیابیاں، عزت یہ نام تم سے ہے
خدا نے جو بھی دیا ہے مقام تم سے ہے

ماں کے لفظ میں کتنی حلاوت اور شیرینی ہے۔ یہ تین حرفی لفظ بولتے ہوئے منہ میں شہد سا گھل جاتا ہے۔ لفظ ماں کا سنتے ہی محبت اور شفقت کے سارے معانی نظروں میں گھوم جاتے ہیں۔ ایثار و قربانی کے سارے مفہوم کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر نے کہا تھا: ”ماں کے بغیر گھر قبرستان لگتا ہے۔“

فردوسی نے کہا: ”اگر مجھ سے ماں چھن جائے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

مفکر پاکستان علامہ اقبال نے کہا: ”سخت سے سخت دل کو ماں کی پُرنم آنکھوں سے موم کیا جا سکتا ہے۔“

نادر شاہ نے کہا: ”ماں اور پھول میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔“

یہ ایک حقیقت ہے کہ ماں کی شخصیت میں نہ جانے قدرت نے کیا اثر رکھا ہے کہ اس کا نام سن کر ہر کسی کا دل موم ہو جاتا ہے، چاہے وہ کتنے ہی غصے والا کیوں نہ ہو۔ ماں ایک انمول موتی اور نور ہے۔ اس کا شفیق اور پُرنور چہرہ دیکھتے ہی آنکھوں میں ٹھنڈک سی اتر آتی ہے۔ کسی دانا کا قول ہے: ”تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔“

ماں کا ظرف اتنا بڑا ہوتا ہے کہ وہ اولاد کی طرف سے دکھ ملنے کے باوجود اولاد کے بارے میں کچھ بُرا سوچنے کا تصور بھی نہیں کرتی۔ ایک دفعہ بوعلی سینا نے کہا: ”اس وقت سے ہمیشہ ڈرو جب

ماں نفرت اور بددعا کے لیے ہاتھ اُٹھادے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور کی چوٹی پر چڑھ کر اللہ تعالیٰ سے گفتگو کرتے تھے۔ اسی دوران ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ وفات سے کچھ عرصہ بعد وہ کوہ طور کی طرف جارہے تھے کہ راستے میں انہیں غیبی آواز آئی: "موسیٰ سنبھل کے آج تمہارے پیچھے ماں کی دعا نہیں ہے۔"

ماں کی عزت و تکریم کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ تاجدارِ مدینہ حضرت محمد ﷺ اپنی رضاعی ماں کا ایسے احترام کرتے کہ جب وہ تشریف لاتیں تو آپ ان کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے۔

جہاں تک ادب و احترام کا تعلق ہے، باپ زیادہ حق دار ہے لیکن حسنِ سلوک اور خدمت کے لحاظ سے ماں کا درجہ بلند ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔"

ایک دفعہ ایک نوجوان حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں جہاد پر جانا چاہتا ہوں۔ آپ اجازت فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟" جواب دیا: "ہاں!" اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "تم جہاد پر جانے کی بجائے اپنی والدہ کی خدمت بجالاؤ کیوں کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔"

ماں جو ناگفتہ اور پراگندہ حالات میں بھی معاشرے میں اپنا دامن عفت سنبھالے رکھتی ہے۔ حوادث زمانہ سے آشکار ہوتے ہوئے بھی رزقِ حلال سے نسل نو کی پرورش کرتی ہے۔ جس کی راتیں یادِ الٰہی میں گزرتی ہیں اور دن روزوں اور عبادات میں بسر ہوتے ہیں۔ ایسی پاکیزہ مائیں ایسے اطفال کو جنم دیتی ہیں۔ جو معاشرے کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔

• اگر دل کی آنکھ سے دیکھا جائے اور نظر سے ٹٹولا جائے، ہر عظیم شخصیت کے پسِ پردہ ماں کی قوت دکھائی دیتی ہے جس نے پنے شب و روز کی محنت سے اس سپوت کو ایسے سانچے میں ڈھالا کہ بیٹا جب بڑا ہوتا ہے تو کوئی صلاح الدین ایوبی کہلاتا ہے اور وئی طارق بن زیاد، محمد بن قاسم یا حیدر علی۔

میدان کارزار ہو یا عدالت معاشرت ہو یا سیاست، روحانیت ہو بادت، ہر میدان میں نیک ماؤں کے بچے ایسے جوہر بکھراں میرتے چلے آرہے ہیں۔ ماں کا خیال آتے ہی ایک لطیف سا ونکا دل کو دھو جاتا ہے۔ دُنیا کی تمام خوبصورتی اور بہاریں صرف ماں ہی کے دم سے ہیں۔ الطاف حسین حالی کا کہنا ہے:

"ماں کی محبت حقیقت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔" ماں کا وجود ایک ایسے سایہ دار شجر کی مانند ہوتا ہے جس کے سائے میں بیٹھ کر انسان تمام دن کی تھکاوٹ دُور کرتا ہے۔ اس کی مہربان آغوش اسے تمام پریشانیوں اور دکھوں سے دُور کر دیتی ہے۔ بس ماں تیرا کوئی جواب نہیں۔

طارق عزیز نے اپنی کتاب "ہمزاد دا دکھ" میں سچا شرک کے عنوان سے ایک خوب صورت قطعہ کہا ہے:

دُور پرے آسمان تے   رب سچے دا ناں
بیٹھاں اس جہان وچ   بس اک ماں ای ماں

ماں وہ ہستی ہے جو اپنی خدمات کا کوئی صلہ نہیں چاہتی۔ اس کی محبت خلوص سے بھرپور ہوتی ہے۔ ماں ایثار کا مکمل مجسمہ ہے۔ ممتا کی وسعتوں کو کوئی چھو نہیں سکتا اور نہ اس کا احاطہ کرسکتا ہے۔ ماں وہ ہستی ہے جس کی مسکراہٹ اولاد کی مسکراہٹ سے وابستہ ہے۔

ماں کی عظمت و بزرگی جتنی بھی بیان کی جائے، اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اولاد کے لیے ماں کا حق ادا کرنا بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

اگرچہ تمام مائیں مثالی نمونہ ہوتی ہیں، تاہم کچھ مائیں نمایاں خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ ایک مثالی ماں وہ ہے جس کی آغوش میں بچے کی بہترین تربیت کا آغاز ہو جائے۔

اسلام نے ماں کو جتنا مقام دیا ہے، اس کا اندازہ نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ جنت تمہاری ماں کے قدموں تلے ہے۔ ایک اور جگہ جب ایک صحابیؓ نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ سب سے زیادہ حسن سلوک کا حق دار کون ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری ماں، یہاں تک کہ تین مرتبہ دریافت کرنے پر بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری ماں۔ اس روایت سے ماں کی عزت و عظمت مزید بڑھ جاتی ہے۔

ساتھیو! ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی ماں کی جتنی ہو سکے، خدمت کریں کیوں کہ ماں وہ واحد ہستی ہے کہ جس کا دُنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ اگر ہم دُنیا و آخرت میں کام یابی چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ماں کو خوش رکھیں۔ اس کا حکم مانیں اور تابع دار رہیں کیوں کہ اسی میں ہماری کام یابی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

"ماں کی دعا جنت کی ہوا" ☆☆☆

اک نام کیا لکھا تیرا ساحل کی ریت پر
پھر ساری عمر ہواؤں سے میری دشمنی رہی
(ثمرہ طارق بٹ، آروپ)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
(کرن فاروق، گوجرانوالہ)

کس آسانی سے وہ ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیتا ہے
خوشی سے بولنا جس شخص کا معمول ہو جائے
(کظیمہ زہرہ، لاہور)

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
(ایمان زہرہ، لاہور)

قتیل مجھ کو یہی سکھایا مرے نبیؐ نے
کہ فتح پا کر بھی دشمنوں کو سزا نہ دینا
(علی عمران، لاہور)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے!
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
(مریم راجہ، راول پنڈی)

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
(وشمہ خان، لاہور)

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکت صبح و شام سے آگاہ

☆

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اُجالا کر دے
(عدن سجاد زینب، جھنگ)

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

☆

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر
(افراح اکبر، لاہور)

رہ گئی رسم اذاں، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

☆

مسلم ہے تو، انداز تیرا بدل کیوں نہیں جاتا
اُٹھ اُٹھ کر گرتا ہے، خدارا سنبھل کیوں نہیں جاتا
(ابرار الحق، ریحان راجہ جنگ)

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

☆

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جتنا جس کا ظرف ہے، اتنا ہی وہ خاموش ہے
(فتح محمد شارق، نوشہرہ وادیٔ سون)

لا کے ماتھے پہ شکن، وقت سے سمجھوتہ کیا
غم کی تاریخ کے ہم اتنے گناہ گار ہوئے
(مریم نایاب، نوشہرہ وادیٔ سون)

یہ فیضانِ نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی
(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
(انعم محمد حنیف، کراچی)

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے
(محمد عثمان علی، بھکر)

ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے
اس ملک کو رکھنا میرے بچوں سنبھال کے
(ماریہ عبدالناصر، کلورکوٹ)

پیارے اللہ کے پیارے نام

راشد علی نواب شاہی

اَلْوَلِیُّ جَلَّ جَلَالُہٗ (ہر چیز کا نگران و ذمے دار)

اَلْوَلِیُّ جَلَّ جَلَالُہٗ تمام چیزوں کا مالک اور اُن کا نگران ہے۔ یہ مبارک نام قرآن کریم میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ آپ بھی پڑھیے۔ "اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ مصیبت کا ارادہ فرماتے ہیں تو کوئی اسے دُور نہیں کر سکتا اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی والی نہیں ہوتا۔" اس لفظ والی سے ہی مولیٰ بنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ۔ دُنیا کا جو نظام چل رہا ہے، اس سارے نظام کی نگرانی اور حفاظت اسی کے ذمے ہے۔ ہم جو کام کاج کرتے ہیں وہ اس میں ہماری مدد فرماتے ہیں۔

چھوٹی بات

"بریرہ بیٹی! یہاں آؤ اور دودھ کو دیکھو، جب اُبلنے لگے تو چولہا بند کر دینا۔" طاہرہ یہ کہہ کر روٹی کے سوکھے ٹکڑے اکٹھے کر کے بوری میں ڈالنے چلی گئیں۔

بریرہ دودھ کے قریب بیٹھ کر پہلے تو بڑے غور سے دیکھتی رہی، پھر وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر شاپنر کے ساتھ پنسل تراشنے لگی اور اس کی توجہ دودھ سے ہٹ گئی۔ جب دودھ اُبل کر نیچے بہنے لگا تو وہ بوکھلا گئی۔ اس بوکھلاہٹ میں چولہا بھی جلدی بند نہ ہو سکا اور اچھا خاصا دودھ نیچے فرش پر بہہ گیا۔

"اُف...... اوہو! بیٹی تم نے دودھ اُبلتے ہی چولہا آہستہ کیوں نہیں کیا یا پھر بند کر دیتی۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمت ضائع ہو گئی۔"

"چلو جلدی سے پونچھا پکڑاؤ۔" طاہرہ نے پونچھے سے دودھ نچوڑ کر ایک ٹوٹی پیالی میں ڈال دیا۔ "چلو یہ پیالی اوپر چھت پر رکھ آؤ، بلی پی لے گی۔"

بریرہ نے آدھے گھنٹے کے بعد چھت پر پیالی دیکھی تو وہ خالی تھی۔ بلی سارا دودھ پی گئی تھی۔ طاہرہ آج قدرے پریشان رہی کہ بریرہ کو، جو ذمہ داری سونپی گئی تھی، اس نے اسے اچھے طریقے سے ادا نہیں کیا۔ کہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ عادت جڑ پکڑ جائے۔

"بریرہ بیٹی! یہ آئس کریم لے لیں۔"

رات کو کھانے کے بعد بریرہ کو امی نے اس کی مزے دار آئس کریم کھلائی۔ "بیٹا! آج دودھ کیسے گر گیا تھا؟"

"امی! میں پنسل شارپ کرنے لگ گئی تھی۔" بریرہ نے جواب دیا۔ "دیکھو بیٹی، جو کام جس وقت دیا جائے تو اسے پوری ذمے داری اور نگرانی سے کرتے ہیں۔ اس طرح جو کام ہوگا وہ صحیح ہوگا۔"

"امی جان، آئندہ خیال رکھوں گی۔"

"شاباش! اچھے بچے ایسے ہی کرتے ہیں۔" اس حوصلہ افزائی پر وہ بہت خوش ہو گئی اور پھر کچھ سوچ کر طاہرہ اسے سمجھانے لگی، کیوں کہ وہ آج اسی واقعے کو لے کر بریرہ کو اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے اور اس کی قدرت بڑی آسانی سے سمجھا سکتی ہے۔

"بیٹی! دودھ گرنے سے تم نے ایک سبق حاصل کیا؟"

"امی وہ کیا؟" بریرہ نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ سبق یہ ہے کہ دودھ کی نگرانی میں ذرا سی کوتاہی ہوئی تو زیادہ دودھ بہہ گیا۔ اسی طرح یہ ساری دُنیا کا نظام ہے۔ اس کی نگرانی اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں۔ اگر اسے نیند آ گئی یا ذرا سی دیر کے لیے اُونگھ آ

جائے تو یہ ساری دُنیا تباہ ہو جائے۔ وہ سارے انسانوں کے کاموں کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس لیے ہمیں اچھے اچھے اور نیکی کے کام کرنے چاہیے۔'' بریرہ بڑے غور سے یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ ''تو پھر آج سے تم بھی ہر کام اچھے طریقے اور ذمہ داری سے کروگی؟''

''جی ہاں! ان شاء اللہ تعالیٰ۔'' بریرہ نے معصومانہ انداز میں کہا۔ یہ جواب سن کر ماں مسکرا اُٹھی۔

اَلْمُتَعَالِ جَلَّ جَلَالُہٗ (برتر)

اَلْمُتَعَالِ جَلَّ جَلَالُہٗ ہر چھپی اور کھلی بات کو جاننے والا ہے۔ سب سے بڑا اور بلند مرتبے والا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں ''اللہ تعالیٰ'' تو یہ لفظ تعالیٰ ''اَلْمُتَعَال'' سے ہی بنا ہے۔ حضور ﷺ کو کافر لوگ کہتے تھے: اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور بیٹیاں بھی ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں خود اپنی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''وہ اللہ بہت بڑے ہیں اور ان کی شان بہت اونچی ہے۔'' اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، وہ ہر عیب سے پاک ہے اور ہر شے سے برتر اور بلند مرتبے والا ہے۔

افضل مخلوق

انسان کو اللہ تعالیٰ نے سب سے افضل مخلوق بنایا ہے۔ یہ سارے حیوانات، پودے، درخت، پتھر، چرند، پرند اور باقی ساری مخلوق اس سے کم درجے کی ہے۔ جس طرح یہ انسان ہر مخلوق سے افضل ہے، اسی طرح اس کے کام بھی ایسے ہونے چاہئیں جو افضل اور اعلیٰ ہوں۔ جو اسے دوسری مخلوق سے بلند بنائیں۔

ہم دردی...... سچ بولنا...... اچھے اخلاق سے پیش آنا...... دوسرے بھائیوں کا خیال کرنا...... وقت پر نماز پڑھنا...... تکلیف دینے والی چیزوں کو راستے سے ہٹانا...... والدین کا کہنا ماننا...... اساتذہ کرام کا ادب کرنا...... بہن بھائیوں کی ضروریات کا خیال رکھنا...... وقت پر اسکول جانا...... دل لگا کر پڑھنا...... آج کا کام کل پر نہ ٹالنا۔

ان سارے اچھے کاموں سے یہ اچھی صفات والا انسان کہلائے گا۔

چند جملے

''ہر بچہ دس سطریں لکھے اور ان سطروں میں جس نے سب سے اچھی اللہ تعالیٰ کی تعریف کی ہو گی، اسے انعام ملے گا۔'' سر احسان نے کلاس میں داخل ہوتے ہی سلام کرنے کے بعد کہا۔

آج سر رفیق صاحب اسکول نہیں آئے تھے تو پرنسپل صاحب نے ان کا متبادل پیریڈ چھٹی کلاس میں لگا دیا۔ سر احسان صاحب نے بچوں کے وقت کو قیمتی بنانے کے لیے ایک عجیب مقابلے کا اعلان کر دیا تھا۔

یہ اعلان سنتے ہی ہر بچہ دس سطروں پر مشتمل اللہ تعالیٰ کی تعریف لکھنے لگا۔ پندرہ منٹ تک سب بچے احسان صاحب کے پاس کاپیاں جمع کروا چکے تھے۔ وہ ایک ایک کاپی چیک کر کے میز پر رکھتے گئے۔

''یہ کس کی کاپی ہے؟'' سب کاپیاں چیک کرنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

بچوں کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں کہ کون اوّل آتا ہے۔

''سر! یہ کاپی میری ہے؟'' حامد نے کہا۔

اوّل انعام کے مستحق حامد ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعریف بہت اچھی تحریر کی ہے اور پھر اسے انعام میں ایک خوب صورت پین دیا اور باقی سب بچوں کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ ''سر! یہ کاپی پڑھ کر سنائیے۔'' عاطف نے خواہش ظاہر کی۔ ''شاباش!'' سر احسان نے عاطف کی اس فرمائش کو بہت پسند کیا۔ سب بچے خاموشی کے ساتھ سننے لگے۔ حامد نے اللہ تعالیٰ کی تعریف یوں کی تھی:

1- تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہے، اسے کوئی یاد کرے یا نہ کرے، مگر وہ کسی کو نہیں بھولتا۔
2- جو اس اللہ سے اُمیدیں وابستہ کرتا ہے تو وہ اسے مایوس نہیں کرتا۔
3- جو اس اللہ پر بھروسا کرتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔
4- جو اس اللہ پر احسان کرے تو وہ احسان کا بدلہ احسان سے دیتا ہے۔
5- وہ ابتدا اور انتہا سے پاک ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔
6- اسی اللہ کے لیے ساری تعریف ہے، جو صبر کا بدلہ نجات سے دیتا ہے۔
7- اسی اللہ کے لیے ساری تعریفیں ہیں، جو پریشانی کے بعد تکلیف دُور کرتا ہے۔
8- وہ اللہ ہی سب کو روزی عطا فرماتا ہے۔
9- وہ اللہ ہی دعائیں قبول فرماتا ہے۔
10- وہ اللہ ہی سب آرزوؤں کا مرکز اور ہر تسلی اور ڈھارس کا سبب ہے۔

سر احسان صاحب نے یہ پیارے تعریفی جملے پڑھ کر سنائے جو اللہ تعالیٰ کی تعریف میں لکھے تھے لیکن حامد آئندہ ایک بات کا دھیان رکھیں۔ جب بھی ''اللہ'' لکھیں تو اس کے ساتھ ''تعالیٰ'' بھی لکھیں، یہ ادب ہے۔

اسی وقت حامد نے ہر اس جگہ جہاں ''اللہ'' لکھا تھا ''تعالیٰ'' کا اضافہ بھی کر دیا۔ اب ہر جملہ ''اللہ تعالیٰ'' کے ساتھ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

☆☆☆

بین الاقوامی شہرت یافتہ گرینڈ ماسٹر

محمد اشرف طائی

نسرین شاہین

جوڈو کراٹے دُنیا کے مقبول کھیلوں میں شامل ہے۔ اولمپکس کے اس ایونٹ میں بڑی تعداد میں مختلف ملکوں کے کراٹے کاز حصہ لیتے ہیں۔ پاکستان جوڈو فیڈریشن اور پاکستان کراٹے فیڈریشن کا سابقہ نام پاکستان جوڈو اینڈ کراٹے بورڈ تھا۔ 1980ء کی دہائی میں ملک بھر میں کراٹے کا کھیل بہت مقبول ہو چکا تھا، تاہم جوڈو کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی، جس کی اس کھیل کو ضرورت تھی۔ پھر پاکستان جوڈو فیڈریشن اور پاکستان کراٹے فیڈریشن کے نام سے دونوں کھیلوں کی الگ الگ فیڈریشنز وجود میں آئیں۔

پاکستان میں جوڈو کراٹے کے کھیل کو متعارف کرانے کا سہرا محمد اشرف طائی کے سر ہے جن کے آباء واجداد کا تعلق حاتم طائی قبیلے سے تھا۔ اشرف طائی 25 مئی 1954ء کو برما میں پیدا ہوئے، جہاں سے ان کے والدین نے مشرقی پاکستان ہجرت کی۔ محمد اشرف طائی نے مشرقی پاکستان میں گریجوایشن تک تعلیم حاصل کی، تاہم انہوں نے برما میں کراٹے سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اشرف طائی نے 1971ء میں پاکستان آ کر یہاں ہل پارک، کراچی کے قریب کراٹے کلب کی داغ بیل ڈالی اور یوں انہیں پاکستان میں کراٹے کے بانی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

پاکستان میں قومی سطح پر کراٹے کے ایونٹس نہ ہونے کے برابر ہیں، حالاں کہ کراٹے کے کلبوں میں نوجوان پریکٹس کرتے نظر آتے ہیں مگر بدقسمتی سے پاکستان میں کراٹے کے کھیل کو وہ کوریج نہیں دی جا رہی ہے جو کرکٹ، ہاکی، اسکواش یا فٹ بال کو دی جا رہی ہے۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا پر اس کو وہ اہمیت نہیں مل رہی جس کا یہ کھیل حق دار ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں فیڈریشن اور ایسوسی ایشنوں کی سرگرمیاں کم ہیں۔ قومی کراٹے مقابلے بھی اتنی تعداد میں نہیں ہو رہے ہیں جو ہونے چاہئیں۔ اگر مقابلوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے اور قومی چیمپئن کو بھی اہمیت دی جائے تو نوجوانوں میں کراٹے سیکھنے کا جذبہ بڑھے گا۔

مارشل آرٹ میں مختلف انداز کے مقابلے ہوتے ہیں، ان میں تائی کوانڈو، جوڈو، کراٹے، ووسٹو اور دیگر انداز شامل ہیں۔ ان کی فیڈریشن علیحدہ ہیں اور قوانین میں بھی الگ الگ ہیں۔ سب کا مقصد مارشل آرٹ کو فروغ اور ترقی دینا ہے۔ دُنیا کے مختلف ممالک میں یہ کھیل صدیوں پُرانا ہے۔ جاپان میں 1882ء میں کراٹے کا آغاز ہوا۔ برما میں کنگ فو اور جوڈو کراٹے سو سال سے زائد عرصے سے کھیلے جا رہے ہیں۔ کوریا، امریکا اور چین میں بھی یہ کھیل خاصا پُرانا ہے۔ وہاں ایک نظام کے تحت مارشل آرٹ کے ایونٹس ہوتے ہیں۔ پاکستان میں 45,40 سال سے یہ کھیل متعارف ہوا ہے۔ اس کے باوجود پاکستان نے ایشیائی اور ساؤتھ ایشین کھیلوں میں کراٹے میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر کے اعزازت حاصل کیے۔ سیف گیمز میں بھی پاکستان نے ایک مرتبہ اس ایونٹ میں نو گولڈ میڈلز جیتے تھے۔ یہ پاکستان کی بڑی کامیابی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں کراٹے کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے جس کی ضرورت ہے۔ کراٹے کاز کو ملازمتیں نہیں دی جاتی، حکومت کی جانب سے گرانٹ کم ملتی ہے۔

اگر پاکستان میں مارشل آرٹ کی ایسوسی ایشنز اور فیڈریشن کے عہدے دار مخلص ہو کر کام کریں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں کراٹے اور مارشل آرٹ مقبول ترین کھیل بن جائیں گے۔ مثبت نتائج کے حصول کے لیے حکمت عملی تبدیل کرنا ہو گی۔ کھلاڑیوں کے لیے کوچنگ کیمپ لگائے جائیں، اکیڈیمیاں قائم کی جائیں۔ جونیئر اور سینئر سطح پر ٹورنامنٹس کی شرح میں اضافہ ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر پاکستان مارشل آرٹ میں قابلِ قدر نتائج حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ غیر ملکی ٹیموں کے ساتھ مقابلے کے ذریعے

اپنے کراٹے کاز کی بہتر انداز میں تربیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان کی صلاحیتوں میں اضافے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں کھیل کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ پاکستان میں مارشل آرٹ کے شعبے میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں، سہولتوں کا فقدان بہت زیادہ ہے۔

ماضی کے مقابلے میں آج جوڈو کراٹے کے حوالے سے لوگوں کا رجحان تبدیل نہیں ہوا بلکہ ماضی میں جوڈو کراٹے سیکھنے والے اسے کھیل کے طور پر سیکھتے تھے، اب اس میں فٹنس کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ جوڈو کراٹے سیکھنے ولا ہر کھلاڑی اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ اس کی فٹنس بہتر ہو جائے۔ اس کا جسم خوبصورت بن جائے، اس کا پیٹ کم ہو جائے تاکہ وہ جاذب نظر لگنے لگے۔ یہ رجحان پاکستان میں ہی نہیں، دُنیا کے دیگر ملکوں میں بھی نظر آرہا ہے۔ امریکا اور یورپ کے کئی ملکوں میں دل کے مریضوں کے لیے ''کارڈک فائٹ'' ہوتی ہے، جس کے دوران انہیں دل کی دھڑکنوں کو بہتر بنانے کے لیے کراٹے کے انداز میں ایکسرسائز کرائی جاتی ہے۔ کک باکسنگ مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ مارشل آرٹ کے ذریعے مختلف بیماریوں کا علاج تلاش کیا جارہا ہے۔

ایک زمانے میں کراٹے ماسٹر کو آٹھ دس سال کی سخت ٹریننگ کے بعد بلیک بیلٹ ملتی تھی، مگر اب بلیک بیلٹ زیادہ محنت و مشقت کے بغیر مل جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کراٹے فیڈریشن کی توجہ اس جانب نہیں، جگہ جگہ جوڈو کراٹے کلب قائم ہو چکے ہیں، جہاں چند ہزار کے عوض کراٹے کی سب سے بڑی بلیک بیلٹ دے دی جاتی ہے۔ ماضی میں آٹھ دس سال کی تربیت کے بعد کراٹے ماسٹر کا فیڈریشن ایسوسی ایشن کی سطح پر قائم کردہ کمیٹی کے سامنے ٹیسٹ ہوتا تھا، جس کے بعد اس کو بلیک بیلٹ دی جاتی تھی۔ اس حوالے سے اشرف طائی کا کہنا ہے۔ ''میں نے نو برس کی عمر میں تربیت شروع کی تھی اور سترہ سال کی عمر میں بلیک بیلٹ کا حق دار بنا۔ اس کے حصول کے لیے دن رات محنت کرنا پڑی، تحریری اور عملی امتحان کے مراحل سے گزر کر یہ مقام حاصل کیا۔''

اگر دیکھا جائے تو دُنیا کے تمام کھیلوں کے مقابلے میں مارشل آرٹ میں سب سے زیادہ ڈسپلن اور عزت کا سبق ملتا ہے۔ جس قدر نظم و ضبط اس کھیل کے کھلاڑیوں میں ہوتا ہے، دوسرے کھیل میں ہرگز نہیں ہے۔ مارشل آرٹ کے ذریعے نوجوانوں کی ذہنی و جسمانی نشوونما کی جاتی ہے۔ ان کے ذہن کو منفی سرگرمیوں، انتہا پسندی اور احساس کمتری سے بچایا جاسکتا ہے۔ اگر ہر اسکول اور دینی مدرسے میں مارشل آرٹ کو لازمی قرار دیا جائے تو بچے اور نوجوان ایک بہتر انداز میں سامنے آئیں گے۔ مارشل آرٹ میں بچے کو اُستاد اور ماں باپ کے احترام کا پیغام دیا جاتا ہے، تاکہ وہ خود کو قابلِ فخر نوجوان ثابت کرسکے۔ جوڈو کراٹے کو پاکستان میں روشناس کرانے والے اشرف طائی کی خدمات سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ اشرف طائی بچپن سے ہی کھیلوں میں شوق سے حصہ لیتے تھے۔ ابتدائی مرحلے میں ریس کے مقابلے میں حصہ لیا، بعد میں کرکٹ شروع کردی۔ فٹ بال کا بھی انہیں شوق تھا۔ نو برس کی عمر میں مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کرنا شروع کردی۔ ان کے اُستاد ڈی پاؤلین تھے۔ اشرف طائی سینٹ تھامس اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس کے بعد چٹاگانگ کے گورنمنٹ کامرس کالج کا حصہ بن گئے۔ وہاں سے بی کام کر کے گریجوایشن کی ڈگری حاصل کی۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں کھیلوں میں بھرپور انداز میں شرکت کی۔ جہاں تک مارشل آرٹ کی جانب آنے کا تعلق ہے تو برما میں کراٹے عام کھیل کی طرح مقبول ہے۔

کراٹے کے ذریعے نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔ مار پیٹ کے بجائے سیلف ڈیفنس کے لیے بھی یہ بڑا مؤثر ہتھیار ہے۔ برما میں بدھ مت کے پیروکار اسے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی بہت اہمیت دیتے ہیں۔ برما میں جوڈو کراٹے کو قومی کھیل کی سی حیثیت حاصل ہے۔

اشرف طائی نے وہاں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ پاکستان آئے تو یہاں مارشل آرٹ کا کوئی تربیتی ادارہ نہیں تھا۔ انہوں نے اس کھیل کو فروغ دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے ابتدا میں صرف پانچ چھ طالب علموں کے ساتھ مارشل آرٹ کا آغاز کیا۔ آج ان کے لاکھوں شاگرد موجود ہیں۔ اشرف طائی نے پاکستان کی دو فلموں ''شیش ناگ'' اور ''پیسہ بولتا ہے'' میں کام کیا۔ ان کا کردار کراٹے ماسٹر کا تھا۔ انہیں دُنیا بھر میں بے شمار ایوارڈ ملے۔ امریکا کے کھیلوں کا سب سے بڑا اعزاز ہال آف فیم ملا۔ چین، جرمنی، برطانیہ، اٹلی، جاپان سمیت کئی ملکوں نے کھیلوں میں خدمات پر ایوارڈ دیئے۔ 1977ء میں اشرف طائی کو کراٹے کا سب سے بڑا بین الاقوامی اعزاز گرینڈ ماسٹر ملا۔ 2004ء میں ان کی کراٹے میں شاندار خدمات پر حسنِ کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ سابق صدر جنرل پرویز مشرف نے دیا۔ اشرف طائی نے پاکستان میں کراٹے کے فروغ کے لیے جو خدمات پیش کیں، وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ قومی سطح پر جوڈو کراٹے کو فروغ ملنا چاہیے تاکہ نوجوان مثبت سرگرمیوں کی جانب مائل ہوں۔ ☆☆
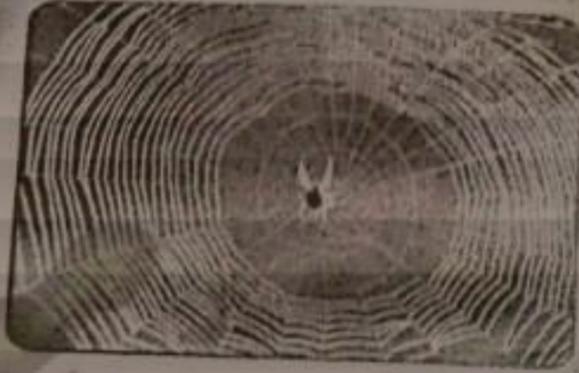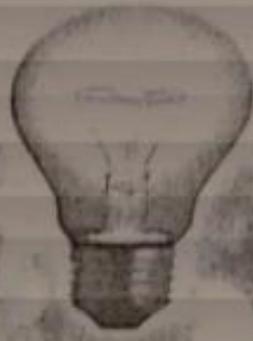
1- چاند ہمارے ساتھ کیوں چلتا ہے؟

جب ہم ٹرین یا موٹر کار میں سفر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اردگرد کی ہر چیز پیچھے کی طرف بھاگ رہی ہے۔ درخت، مکانات، بجلی کے کھمبے مخالف سمت میں دوڑے جا رہے ہیں لیکن جب ہم چاند کی طرف دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے، پیچھے کی طرف نہیں بھاگ رہا!

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ چاند بھی درختوں اور کھمبوں وغیرہ کی طرح پیچھے کی طرف کیوں نہیں بھاگتا؟ ہمارے ساتھ ساتھ کیوں چلتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چاند ہماری زمین سے تقریباً 239,000 میل دُور ہے اور اس کا قطر (ڈایا میٹر) 2,160 میل ہے لیکن چوں کہ وہ ہمیں بہت قریب اور بڑا معلوم ہوتا ہے، اس لیے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ 239,000 میل بہت بڑا فاصلہ ہے اور اس فاصلے کے مقابلے میں جو ہماری موٹر کار یا ٹرین چند منٹ میں طے کرتی ہے، یہ فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ چناں چہ جب ہماری گاڑی سیدھی اور لمبی سڑک پر چل رہی ہوتی ہے تو وہ زاویہ (Angle) جس سے ہم چاند کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، تبدیل نہیں ہوتا اور جب کہ ہمیں اپنے اردگرد کی چیزیں پیچھے بھاگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ چاند کے بارے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

2- مکڑی اپنے جالے میں خود کیوں نہیں پھنستی؟

مکڑی کے جسم میں ننھی ننھی نلکیاں یا ٹیوبیں ہوتی ہیں جنہیں تار بنانے والے عضو (Sinnerets) کہتے ہیں۔ ان ٹیوبوں میں سے رقیق مادہ نکلتا ہے جو ہوا لگنے سے سخت ہو کر تار یا دھاگا بن جاتا ہے۔ مکڑی انہی دھاگوں سے جالا بنتی ہے۔ یہ دھاگے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک دھاگا لیس دار ہوتا ہے۔ مکھی، مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے اسی دھاگے میں پھنستے ہیں۔ دوسرا دھاگا لیس دار نہیں ہوتا۔ مکڑی جالے پر چلتی ہے تو اسی دھاگے پر پاؤں رکھتی ہے، اس لیے وہ جالے میں نہیں پھنستی۔

3- بلب کا تار پگھلتا کیوں نہیں؟

جب کوئی دھات گرم ہو جاتی ہے تو دہکنے لگتی ہے اور پھر پگھل جاتی ہے۔ بجلی کے بلب کے اندر باریک سا ایک تار ہوتا ہے جب اس میں بجلی کا کرنٹ دوڑتا ہے تو وہ اس کی حرارت سے گرم ہو کر چمکنے لگتا ہے پگھلتا نہیں۔ کیوں؟ جواب یہ ہے کہ بلب کے اندر ایک تار خاص دھات سے بنایا جاتا ہے جو تمام دھاتوں سے سخت دھات ہے۔ اسے ٹنگسٹن (Tungston) کہتے ہیں۔ یہ دھات ریاست ہائے متحدہ امریکہ، روس، برما، کوریا، چین اور جنوبی امریکا میں پائی جاتی ہے۔

4- تیل میں پانی حل کیوں نہیں ہوتا؟

تیل پانی میں اس لیے حل نہیں ہوتا کہ ان دونوں کے مالیکیول (وہ ننھے ننھے ذرے جن سے تیل اور پانی بنے ہیں) ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ تیل کے مالیکیول پانی کے مالیکیولوں سے بہت بڑے ہوتے ہیں اور ان میں ایٹم بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ پانی اور تیل کے برخلاف بہت سے سیال (Liquids) ایک دوسرے میں حل ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کے مالیکیول ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔

گھوڑا
ایک تیز رفتار اور پُر وقار سواری

گھوڑے اور انسان کا تعلق برسوں پُرانا ہے۔ سیر و تفریح اور مفید کام کاج کی خاطر پالنے کے لیے بہترین چوپایہ ہے۔ ''پہلے دوڑو، پھر سوچو'' گھوڑے کی ایک فطری جبلت ہے، جس سے گھوڑے سدھانے والے بڑا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ گھوڑی ہر سال ایک بچہ دیتی ہے گھوڑوں کی پرورش میں عرب کے صحرائی بدو بہت شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ گھوڑا ایک معاشرت پسند حیوان ہے۔ گھڑ سواری کا ذکر بہت قدیم زمانوں سے چلا آ رہا ہے۔ پُرانے بادشاہوں، فوجوں اور شکاریوں کی گھڑسواری کے واقعات بہ کثرت ملتے ہیں۔ مشہور ہندوستانی مسلمان بادشاہ شیر شاہ سوری نے گھوڑے کو ڈاک کے نظام کے لیے استعمال کیا۔ آج بھی ہم موٹر کاروں اور متعدد مشینی انجنوں کی طاقت اور صلاحیت متعین کرنے کے لیے ہارس پاور (اسپی طاقت) کا یونٹ استعمال کرتے ہیں۔

گھوڑے کی متعدد اقسام ہیں۔

ترپان نسل کے گھوڑے چھوٹے قد کے ہوتے ہیں جنہیں ٹٹو بھی کہا جاتا ہے۔ ابتداء میں انہیں مشرقی یورپ اور یوکرائن میں پالا گیا۔ یہ گھوڑے اب منگولیا، مانچوریا، یورپ، مغربی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور آسٹریلیا میں عام پائے جاتے ہیں۔

گرم خون والے گھوڑوں کی ٹانگیں لمبی اور مضبوط ہوتی ہیں۔

سرد خون والے گھوڑے زیادہ تر بھاری بھر کم جسم اور ٹانگیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔

گھوڑوں اور گدھوں کے اختلاط سے عام خچر اور ہنی خچر پیدا ہوتے ہیں۔ عام خچر نر گدھے اور مادہ گھوڑے کے ملاپ سے پیدا ہوتے ہیں جو مضبوط جسم کے ہوتے ہیں۔ ہنی خچر نایاب ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں گھوڑے کا ذکر بہ کثرت ملتا ہے۔ یعنی سورۃ الانفال میں گھوڑا بطور سامانِ دفاع، سورۃ النحل میں بطور سواری، سورۃ ص میں بطور مالِ غنیمت کے گھوڑوں کی منصفانہ تقسیم، سورۃ العٰدیٰت میں بطور تیز رفتار گھوڑوں کی قسم کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت سلیمانؑ نے گھوڑوں کی دوڑ کروائی، حضرت سلیمانؑ کی گھوڑوں اور جانوروں میں دلچسپی معنی خیز ہے جس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

قیمتی جانور، اصیل گھوڑے اور ہر قسم کا مال و دولت اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمتیں ہیں۔ ان کی ملکیت سے انسان میں غرور و تکبر آ جاتا ہے اور یادِ الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے۔ یہ ناشکری کی علامت ہے بلکہ ان نعمتوں اور آسائشوں کے عطا ہونے پر اللہ تعالیٰ کے شکر اور عبادت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

گھوڑوں میں صحت مند دلچسپی، گھوڑے پالنا، ان کی افزائش نسل کرنا، ان کی دوڑیں لگوانا، انہیں سیر و تفریح اور کام کاج میں استعمال کرنا، ان کی مناسب دیکھ بھال کرنا، ان سے شفقت برتنا، یہ اچھا اور جائز ہے۔ البتہ ان پر شرطیں لگانا اور جوا کھیلنا اسلام میں ممنوع ہے۔ اسی طرح پالتو جانوروں کی دیکھ بھال نہ کرنا اور ان پر ظلم کرنا بھی قطعی مناسب نہیں۔

☆☆☆

قرض

عاطر شاہین

نصیب کریانہ سٹور رحیم آباد محلے کا بہت پُرانا اور مشہور سٹور تھا۔ اس سٹور کا مالک مراد علی پڑھا لکھا، ایمان دار اور نیک آدمی تھا۔اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ محلے میں لوگ اس سے اُدھار چیزیں لیتے تھے تو وہ انہیں بغیر حیل وحجت کے دے دیتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو انکار نہیں کیا تھا۔ اس کا صرف ایک اصول تھا کہ جو کوئی بھی اُدھار چیزیں لے تو وہ مہینے کے آخر میں اپنے اُدھار کا حساب کتاب کر دے۔ یہی وجہ تھی کہ محلے کے لوگ مراد علی کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ اقبال کا بھی نصیب کریانہ سٹور میں اُدھار کا کھاتہ تھا۔ اس کے گھر والوں کو جب کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو وہ اس کے سٹور پر چلے جاتے اور سامان لے آتے۔ بعد میں مراد علی چیزوں کے نام اور ان کے پیسے کھاتے میں لکھ دیتا تھا۔

اقبال ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ بارہ ہزار روپے تھی۔ اس کے والدین وفات پا چکے تھے۔ اقبال کی شادی کو تین سال ہو گئے تھے۔ اس کا دو سال کا ایک بچہ بھی تھا جس کا نام حمید تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزار رہا تھا۔

اُس دن اتوار تھا اور اقبال کو فیکٹری سے چھٹی تھی۔ مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ اقبال اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے میں مصروف تھا جب کہ اس کا بیٹا حمید کھیلنے میں مگن تھا۔ اتنے میں اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔

''حمید کے ابو!'' اقبال کی بیوی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا تو اقبال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اقبال کو حمید کے ابو ہی کہہ کر پکارتی تھی۔ ''کیا بات ہے بانو! کیا کچھ چاہیے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''ہاں! گھی ختم ہو گیا ہے، وہ لے آئیں۔'' بانو نے جواب دیا۔

''اوہ! آج تو مہینے کی آخری تاریخ ہے اور میرے پاس پیسے بھی ختم ہو چکے ہیں۔'' اقبال نے کہا۔

''آپ کا نصیب کریانہ سٹور پر اُدھار کا کھاتہ تو ہے۔ آپ اُدھار گھی لے لیں۔'' بانو نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے، میں گھی اُدھار لے آتا ہوں۔'' اقبال نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں کے بعد وہ گھر سے نکل کر نصیب کریانہ سٹور کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ سٹور اس کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ دُکان کے اوپر ایک نیون سائن بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ''نصیب کریانہ سٹور'' نمایاں الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔ وہاں دو گاہک پہلے سے موجود تھے۔ اقبال اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ جب دونوں گاہک اپنا اپنا سامان لے کر چلے گئے تو اقبال، سٹور میں داخل ہو گیا۔

''ارے، اقبال میاں! کیا حال ہے؟ کیا آج فیکٹری سے چھٹی کر لی ہے؟'' مراد علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مراد بھائی! کیا تم بھول گئے ہو کہ آج اتوار ہے اور اتوار کو

میری چھٹی ہوتی ہے۔'' اقبال نے بھی مسکرا کر جواب دیتے ہوئے کہا تو مراد علی بھی ہنس پڑا۔ ''اوہ! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ آج اتوار ہے۔'' مراد علی نے کہا۔ ''خیر بتاؤ، کیا چاہیے؟''

''ایک کلو گھی دے دو۔'' اقبال نے کہا تو مراد علی نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ایک ڈبے سے گھی کا پیکٹ نکالنے لگا۔ اسی لمحے ایک اور گاہک دُکان میں داخل ہو گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ مراد علی نے ڈبے سے ایک کلو گھی کا پیکٹ نکالا اور اسے شاپر میں ڈال کر اقبال کو دے دیا۔ ''مراد بھائی! میرے کھاتے میں اس کے پیسے لکھ لو۔ کل یکم ہے اور مجھے تنخواہ مل جائے گی تو شام کو آ کر سارا اُدھار دے دوں گا۔'' اقبال نے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی، کوئی مسئلہ نہیں۔'' مراد علی نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا جب کہ اقبال گھی کا پیکٹ لئے گھر آ گیا۔ اس نے گھی اپنی بیوی کے حوالے کیا اور خود کمرے میں آ کر ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے بیٹھ گیا۔ ☆

یکم تاریخ کو اقبال کو فیکٹری سے تنخواہ مل گئی تو وہ شام کو مراد کی دُکان پر پہنچ گیا۔ دُکان پر چند لوگ موجود تھے۔ اقبال اپنی باری کے انتظار میں کھڑا ہو گیا جب اس کی باری آئی تو مراد اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا چاہیے اقبال بھائی؟'' ''میں پیسے دینے آیا ہوں۔'' اقبال نے کہا۔ ''میرے کھاتے والی پرچی دے دو۔''

''اچھا!'' مراد نے کہا اور پھر اس نے ایک رجسٹر اُٹھایا اور اس میں سے ایک پرچی نکال کر اقبال کو دے دی۔ مراد علی رات کو ہی سب کھاتہ داروں کا حساب کتاب کر کے علیحدہ علیحدہ پرچیاں بنا لیتا تھا۔ اقبال نے پرچی پر پیسے دیکھے تو اس پر ساڑھے چھ سو روپے لکھے تھے۔ اقبال نے پرچی جیب میں ڈالی اور ساڑھے چھ سو روپے مراد کی طرف بڑھا دیئے۔

''یہ لیں مراد بھائی! رجسٹر سے میرا نام کاٹ دیں۔''

''میں کاٹ دوں گا، تم بے فکر ہو جاؤ۔'' مراد نے پیسے لیتے ہوئے کہا۔ ''سامان چاہیے؟''

''ہاں! میں سامان کی لسٹ بنا لایا ہوں۔'' اقبال نے کہا اور پرچی اسے دے دی۔ تھوڑی دیر کے بعد اقبال ضرورت کا سامان لے کر اپنے گھر آ گیا۔ اس نے سامان اپنی بیوی کے حوالے کیا اور خود کمرے میں آ کر ٹی وی آن کر کے اسپورٹس چینل دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میچ دیکھنے کے دوران ہی اس نے غیر ارادی طور پر جیب سے پرچی نکالی اور دیکھنے لگا۔ اس نے مراد سے جو چیز بھی اُدھار لی تھی وہ بمعہ تاریخ اس پرچی پر درج تھی۔ پھر جیسے ہی اقبال کی نظر پرچی میں آخری چیز پر پڑی تو وہ بے اختیار چونک پڑا۔ پرچی پر آخری چیز پانچ کلو آٹا لکھا تھا اور اس پر تاریخ بیس اکتوبر درج تھی حالاں کہ اقبال گزشتہ روز ہی ایک کلو گھی مراد علی سے لے آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مراد علی پرچی پر گھی اور اس کی قیمت لکھنا بھول گیا تھا۔ اقبال نے سوچا کہ ایک کلو گھی کے پیسے مراد کو دے دینے چاہئیں لیکن پھر اس کے دل میں شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ چھوڑو، مراد بھول گیا ہے اس طرح اس کے پیسے بچ جائیں گے پھر اقبال کے ضمیر نے کہا کہ نہیں، وہ ایسا ہرگز نہ کرے گا۔ اگر مراد بھول گیا ہے لیکن تمہیں تو یاد ہیں ناں۔ اگر تم مراد کو پیسے نہیں دو گے تو روزِ قیامت تم اسے کیا منہ دکھاؤ گے۔ اللہ کے سامنے بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بے ایمانی سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ایک سو پچاس روپے سے تم کیا خرید لو گے۔ سوچو اور شیطان کے بہکاوے میں نہ آؤ۔ شیطان اسے بے ایمانی پر مجبور کر رہا تھا کہ وہ خاموش رہے اور پیسے اپنے پاس رکھے مگر اس کا ضمیر جھنجھوڑ رہا تھا اور اسے سیدھی راہ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ضمیر اور شیطان کے درمیان کشمکش چل رہی تھی۔ اقبال گہری سوچ میں غرق تھا۔

''نہیں، نہیں میں مراد کو پیسے ضرور دوں گا۔ میں بے ایمانی نہیں کروں گا۔ اگر میں نے مراد علی کو پیسے نہ دیئے تو یہ اس کا مجھ پر قرض ہو گا جو شاید میں روزِ قیامت چکا نہ سکوں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ شکر ہے میری آنکھیں بروقت کھل گئی ہیں۔'' اقبال نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ٹی وی آف کیا اور کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی لمحے اس کی بیوی بانو کچن سے باہر آئی۔ وہ اقبال کو باہر جاتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''اقبال! آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' ''مراد کو پیسے دینے۔''

''ابھی تو آپ پیسے دے آئے ہیں۔''

''ہاں...... لیکن اس کا اُدھار ابھی رہ گیا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' اقبال کی بیوی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''آ کر بتاتا ہوں۔'' اقبال نے کہا اور پھر وہ گھر سے نکل کر نصیب کریانہ سٹور کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پر فتح کی چمک تھی کہ وہ شیطان کو شکست دینے میں کام یاب ہو گیا تھا اور وہ گناہ گار ہونے سے بچ گیا تھا۔

☆☆☆

فتح محمد عرشی

کھڑ کھانڈ گروپ ورلڈ کپ

پاکستان کوارٹر فائنل میں آسٹریلیا کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ بے شک ہر دلِ درد مند رکھنے والے پاکستانی کو دکھ پہنچا تھا لیکن یہ تو قسمت کے کھیل ہیں۔ جب دو پہلوان کشتی لڑتے ہیں تو ایک تو ہارتا ہے۔ ایک کی جیت دوسرے کی ہار بن جاتی ہے۔

لیکن یہ باتیں بڈارے کو کون سمجھاتا؟ بقول گنجے والا: ''اس کی باتوں سے غداری کی بو آتی تھی۔'' وہ الزامات کا پٹارہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ ''ارے پاکستان ٹیم ہے ہی ایسی...... اس پر بھروسا کرنے والے احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ ارے ٹیم ہے تو آسٹریلیا کی...... سب آل راؤنڈر!''

''بس بس...... تم ایک بات بتاؤ؟'' گنجے والا نے جل کر کہا۔ ''تم آسٹریلین ہو یا پاکستانی؟''

''میں جو بھی ہوں، دل تو ان کے ساتھ ہے۔ آسٹریلیا از دی بیسٹ!'' بڈارے نے بے شرمی کی انتہا کر دی۔

''ارے جاؤ...... پاک ٹیم بیسٹ ہے۔'' ملنگی کو بھی غصہ آ گیا۔

''اچھا.... تو فیصلہ ابھی کر لیتے ہیں۔'' بڈارے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ہم آپس میں میچ کھیل لیتے ہیں۔ اگر تم جیت گئے تو پاکستانی ٹیم بیسٹ، ورنہ تمہیں ماننا پڑے گا کہ آسٹریلیا ہی اصل چیمپئن ہے۔ آسٹریلیا..... مائی فیورٹ ٹیم!''

''آسٹریلیا نے کون سا تیر مار لیا ہے؟ ''پاکستان کو تو ہرا دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے، ہم سے تو آگے ہیں۔ تم میچ کیوں نہیں کھیل لیتے؟''

''او کے ڈن!'' گنجے والا نے فوراً ہی چیلنج قبول کر لیا تھا۔ ''کل ہمارا میچ ہوگا۔''

''او کے! میلبورن کے گراؤنڈ میں..... کل ٹھیک آٹھ بجے پہنچ جانا۔ ٹاٹا....'' بڈارے نے کہا اور ایک طرف چل دیا۔

کھڑ کھانڈ گروپ اس وقت تو خاموش رہا لیکن 'بھوت حویلی' پر پہنچتے ہی گنجے والا کو گھیر لیا۔ ''ارے بے وقوف! بڈارے کی ٹیم بہت مضبوط ہے اور وہ خود بھی بہت اچھا پلیئر ہے۔'' ملنگی نے غصے سے کہا۔

''ہاں.... اور کیا....؟ ہماری شکست یقینی ہے!'' چھوٹے والا نے فیصلہ سنا دیا۔

''جو بھی ہو، میں پاکستان کے خلاف بات نہیں سن سکتا۔'' گنجے والا کا جذبہ قابلِ دید تھا۔ ''ارے! ہائیں.... اسے تو ہم بھول ہی گئے، اب ہماری فتح یقینی ہے۔'' گنجے والا اچانک خوشی سے اُچھل پڑا۔

''کسے بھول گئے؟'' سارے کھڑ کھانڈیوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''عرشی صاحب کو..... اس کے کچھ دوست بہت اچھے کھلاڑی ہیں، وہ ہمارے خفیہ ہتھیار ہوں گے۔'' گنجے والا نے رازدارانہ

انداز میں کہا۔

"اوہ! واقعی..... انہیں تو ہم بھول ہی گئے تھے۔" سب کے منہ سے نکلا۔

"مبارکاں، مبارکاں..... ایڈوانس مبارکاں۔" پتا نہیں مبارکاں کس کونے میں چھپا بیٹھا تھا۔

شکر ہے، اس نے مرغی کا نام نہیں لیا تھا، ورنہ گنجے والا اسے کچا چبا ڈالتا کیوں کہ پاکستان کے ورلڈ کپ جیتنے کی خوشی میں وہ کل ہی کھڑکھاند گروپ کو دو کلو مرغی کھلا چکا تھا۔

......☆......

میچ والے دن کھڑکھاند گروپ جب میلبورن کے گراؤنڈ کی طرف روانہ ہوا تو گیارہواں کھلاڑی ایسے غائب تھا، جیسے گدھے کے سر سے سینگ..... تو گویا "کھڑکھاند سکواڈ 10" کچھ اس طرح تھا:

گنجے والا، چھوٹے والا، ننگی، مبارکاں، دادا بڈی، جشنی ماما، دلشان، بگیاڑہ، دانش اور عامر سہیل۔

گیارہویں کھلاڑی کا مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ گراؤنڈ کی طرف جاتے جاتے اچانک راستے میں شاکا مل گیا۔ بانسری ہاتھ میں لیے وہ اپنے ریوڑ کے ساتھ رواں دواں تھا۔ دادا بڈی نے اسے روکتے ہوئے میچ کی دعوت دی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ "ارے واہ! میں تو ضرور آوں گا، بکریاں پھنن سائیں نال۔"

گنجے والا نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے کبھی ہاتھ میں بلا پکڑا بھی ہے یا نہیں؟"

"ہاہاہا....." شاکا نے ایک بے ڈھنگا قہقہہ لگایا۔ "ہماری نظر میں تو کرکٹ گیارہ گیندوں کا کھیل ہے۔"

وہ واقعی گنجے والا کو ٹینشن دے رہا تھا لیکن خیر، مجبوری تھی۔ ٹیم تو پوری کرنی تھی۔

جلد ہی وہ میلبورن کے گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ یہ ٹیلوں میں گھرا ہوا ایک کرکٹ گراؤنڈ ہے، جس کی ایک سائیڈ پر 'آک' کے بڑے بڑے پودوں کا ایک جھنڈ بھی ہے۔ دیہاتی گراؤنڈ کا عمدہ نمونہ! کبھی کبھی یہاں ریڑھی لگانے والے بھی آ جاتے ہیں۔ آج بھی ایک ریڑھی والا گنڈیریاں بیچنے آیا ہوا تھا۔

بڈارے کی ٹیم بھی پہنچ چکی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ خود بھی ایک اچھا پلیئر تھا اور اس کی ٹیم بھی کافی مضبوط تھی لیکن سوال تھا پاکستان کی عزت کا..... اس لیے کھڑکھاند گروپ سر پہ کفن باندھ کے میدان میں کود پڑا تھا۔ (ارے بھائی.... حقیقتاً نہیں، بلکہ محاورتاً!)

کھڑکھاند گروپ کی اصل طاقت عامر سہیل، دلشان اور دانش تھے۔ عامر سہیل ایک نوجوان لڑکا تھا اور کمال کی بیٹنگ کرتا تھا۔ یوں سمجھیں کہ وہ کھڑکھاند گروپ کا 'ڈی ویلیئر' تھا۔ دو دن پہلے اس نے آخری اوور میں تین لگاتار چھکے لگا کر ایک میچ جتوایا تھا جو گنجے والا اینڈ کمپنی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دلشان کا اصل نام تو ذیشان تھا، لیکن اس کی کارکردگی دیکھتے ہوئے لوگ اسے "دلشان" کہنا پسند کرتے تھے۔ اپنی ٹیم کی طرف سے سب سے زیادہ ففٹیاں اسکور کرنے کا اعزاز اسے ہی حاصل تھا۔ اس کی ایوریج کمال کی تھی اور دانش..... یہ غضب کا باؤلر تھا۔ سٹین کی طرح....! افواہ سنی گئی تھی کہ پچھلے دنوں اس نے ایک میچ کے دوران آخری اوور میں مخالف ٹیم کو دو رنز نہ کرنے دیئے تھے، اس لیے کھڑکھاند گروپ ان تین 'ینگ پلیئرز' کی وجہ سے بہت خوش تھا۔

کھڑکھاند گروپ تو آپ کا دیکھا بھالا ہے۔ گنجے والا کو پوری اُمید تھی کہ وہ آفریدی کا شارجہ والا ریکارڈ آج ضرور توڑیں گے۔

"ہاہاہا..... آ گئے ٹیم لے کے....." بڈارے نے طنزیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ "آج ہم انہیں مزہ چکھائیں گے۔"

گنجے والا نے خلافِ توقع بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "یہ تو ابھی پتا چل جائے گا کہ مزہ کون چکھاتا ہے..... آؤ پہلے ٹاس کر لیں۔"

"اوکے!" بڈارے نے کہا اور ایک سکہ نکالتے ہوئے گنجے والا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ گنجے والا نے فوراً کہا۔ "چاند!"

"کیا مطلب؟" بڈارا حیران رہ گیا۔

"ہاہاہا....." عامر سہیل نے ہنس کر کہا۔ "کیپٹن صاحب کا مطلب ہے..... ہیڈ (Head)"

یہ سن کر دونوں ٹیمیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں لیکن گنجے والا خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اسے "کیپٹن صاحب" کا خطاب جو مل چکا تھا۔

خیر، ٹاس ہوا اور گنجے والا نے جیت لیا۔ اگرچہ ٹیم فیلڈنگ کے حق میں تھی، لیکن گنجے والا نے کہا کہ ہم پہلے بیٹنگ کریں گے۔ پندرہ، پندرہ اوورز کا میچ طے ہوا۔ یہ بھی شرط رکھی گئی کہ ایک کھلاڑی زیادہ سے زیادہ پانچ اوورز کر سکتا ہے۔

عامر سہیل اور دلشان کو اوپنر بھیجا گیا حالاں کہ گنجے والا بڈارے کو خود سبق سکھانے کو بے تاب تھا۔ کھیل شروع ہوا، پہلا اوور

بڈارے نے خود کیا۔ پہلی ہی بال پر عامر سہیل نے ایک شان دار چھکا لگا دیا۔ کھڑ کھاند گروپ خوشی سے جھوم اُٹھا۔ بڈارے کا رنگ اُڑ گیا۔ اوور کے اختتام پر بیس رنز بن چکے تھے۔ پھر تو دلشان اور عامر سہیل نے بڈارے کرکٹ کلب کے ہوش اُڑا دیئے۔ جب پہلی وکٹ گری تو سات اوور کے اختتام پر سنچری مکمل ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ گنجے والا کریز پر جاتا، دادا بڈی اس سے پہلے پہنچ گیا۔

بڈارے کی طرف سے اس وقت ایک فاسٹ باؤلر بال کروا رہا تھا۔ جب اس نے بال پھینکا تو دادا بڈی نے آؤ دیکھا، نہ تاؤ... بس زور سے بیٹ گھما دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ گیند اس کے بیٹ گھمانے سے پہلے ہی وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔ اوور ہوتا رہا، دادا بڈی زور وشور سے بیٹ گھماتا رہا لیکن بیٹ کو بال سے ہمکنار ہونے کا ''شرف'' حاصل نہ ہو سکا۔ سارا کھڑ کھاند گروپ دانت پیس کر رہ گیا۔

دلشان وکٹ پر آیا اور پہلی ہی گیند پر شان دار چھکا! گنجے والا تو اُٹھ کر ناچنے لگا لیکن شاید کھڑ کھاند گروپ کا ستارہ گردش میں آ چکا تھا۔ اگلی بال پر دلشان کیچ آؤٹ ہو گیا۔ اب بڈارا خوشی سے ناچنے لگا۔ یہ دیکھ کر گنجے والا آگ بگولا ہو گیا اور تقریباً دوڑتا ہوا وکٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے جاتے ہی بلا زور سے گھمایا اور چار رنز....

''زبردست گنجے والا زبر دست....'' ملنگی چلایا۔ یہ شاید 'بائی چانس سٹروک' تھا کیوں کہ اگلی تین بالز کا حشر وہی ہوا جو دادا بڈی نے پورے اوور کا کیا تھا۔

''دادا بڈی ایک بار پھر وکٹ پر....'' چھوٹے والا نے اچانک بلند آواز سے کمنٹری شروع کر دی۔ ''بال آئی.... زور سے بیٹ گھمایا.... ور.... اور بال کو ہٹ لگانے میں کام ب.... بال گیپ میں سے ہوتی ئی سیدھی باؤنڈری کی طرف.... ب رنز مکمل.... اور اب دوسرے رنز

کے لیے دوڑے.... ارے.... ہائیں.... یہ کیا ہوا؟'' چھوٹے والا نے اچانک حیران ہو کر کہا۔

گنجے والا اور دادا بڈی پچ کے درمیان میں ہی ایک دوسرے سے ٹکرا کر گر پڑے تھے۔ گنجے والا جلدی سے اُٹھ کر بھاگا۔ دادا بڈی اُٹھ کر بھاگنے لگا۔

اب شاکا وکٹ پر تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے بیٹ گھما دیا۔

''دو رنز.... ویل ڈن شاکا ویل ڈن....!'' چھوٹے والا چلایا۔

اگلی بال پر شاکا نے ایک زبردست ہٹ لگانے کی کوشش کی۔ ہٹ تو نہ لگی البتہ اس کا پچھلا پیر وکٹوں سے ضرور جا لگا۔ گنجے والا نے بھنا کر کہا۔ ''اندھے ہو گیا....؟''

''نو ٹینشن....'' شاکا نے لاپرواہی سے کہا۔ ''میں نے دراصل مصباح اسٹائل میں ہٹ لگانے کی کوشش کی تھی۔''

اب دانش کی باری تھی۔ اوور کی آخری گیند پر ایک رنز بن سکا۔ دانش پھر وکٹ پر تھا۔ گنجے والا نے اسے ایسے دیکھا جیسے اسے کچا چبا جائے گا۔ اب بڈارے کا اوور تھا۔ تین بالز پر سات رنز بنے تو گنجے والا وکٹ پر آیا۔ بڈارے نے گنجے والا کو ایک خطرناک باؤنسر مارا اور گنجے والا 'ہائے اللہ....' کہتے ہوئے 'ناک آؤٹ' ہو گیا۔

پانچویں گیند پر ملنگی سامنا کر رہا تھا۔ خوف سے اس کی ٹانگیں

بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھیں۔ بڈارے نے ایک زبردست 'یارکر' پھینکا۔ ملنگی کی ٹانگیں ہوا میں بلند ہوئیں اور ملنگی کو یوں لگا جیسے آسمان نے اچانک قلابازی کھائی ہو اور وہ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل گیا ہو۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ منہ کے بل زمین پر پڑا تھا اور اس کی وکٹیں گر چکی تھیں۔

''ہیٹ ٹرک چانس......!!!'' بڈارا خوشی سے چلایا۔

اب آخری بال کا سامنا کر رہا تھا...... جشنی ماما!

بڈارے نے ایک لمبا اسٹارٹ لیا اور گویا بجلی سی چمکی تھی۔ جشنی ماما اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ ایمپائر نے چلا کر کہا۔ ''نو بال......!''

جشنی ماما نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔ ''ہاہاہا...... مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ اس نے بال نہیں پھینکنی، ویسے ہی بیل کی طرح دوڑتا ہوا آیا ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر کھڑکھاند گروپ نے اپنا سر پیٹ لیا۔

ایمپائر نے فری ہٹ کا اشارہ کیا۔ جشنی ماما نے اندھا دھند بلا گھمایا۔ بلا تو بال کو نہ چھو سکا البتہ بائی کا چوکا ضرور لگ گیا اور پھر چودہ اوورز کے اختتام سے پہلے ہی 166 رنز پر کھڑکھاند گروپ کا خاتمہ بالخیر ہو گیا تھا۔

پانی کے ایک مختصر سے وقفے کے بعد کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ پہلا اوور دانش نے کیا تھا اور مخالف ٹیم کی دس رنز کے بدلے میں ایک اہم وکٹ لینے میں کام یاب ہو گیا تھا۔

اب تو کھڑکھاند گروپ کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ اگلا اوور گنجے والا نے کرایا اور اسکور تیس تک پہنچ گیا۔

دانش کے اوور میں اسکور کم ہو جاتا لیکن اگلا اوور پھر بھاری پڑتا...... ٹو ڈاؤن پر بڈارا خود آ گیا۔

''ارے شاکا کہاں ہے جو کہتا تھا کہ کرکٹ گیارہ گیندوں کا کھیل ہے، اب اسے اوور کرانے دو!'' گنجے والا نے بدحواس ہو کر کہا۔

''لو جی...... آ گیا۔'' شاکا نے الہ دین کے جن کی طرح حاضر ہو کر کہا۔

شاکا دوڑتے ہوئے آئے...... گیند کی...... اور گیند باؤنڈری سے باہر...... شان دار چھکا!

اور پھر دوسرا چھکا...... تیسرا چھکا...... اور لگاتار چھے چھکے...... شاکا نے سچ ہی کہا تھا کہ کرکٹ گیارہ گیندوں کا کھیل ہے۔ گنجے والا کو یقین تھا کہ اگر ایک اوور اسے اور دیا گیا تو عبرت ناک شکست ان کا مقدر بن جائے گی۔

''ٹینشن نہیں لینی...... اگلے اوور میں مَیں بڈارا ٹیم کو تباہ کر دوں گا۔'' شاکا نے ہٹ دھرمی کی انتہا کر دی۔

اگلا اوور پھر گنجے والا نے لیا، دوسری گیند پر بڈارا سامنے تھا۔ گنجے والا نے دانت پیس کر بال کرائی اور میدان ''وہ مارا......!'' کے نعرے سے گونج اُٹھا۔ ایک وکٹ گر چکی تھی۔ ایمپائر نے انگلی اُٹھا دی۔ بڈارے نے بے یقینی سے گری ہوئی وکٹ کو دیکھا اور مایوسی سے جھکا کر چل دیا۔

''مبارکاں، مبارکاں۔'' مبارکاں نے گنجے والا کو گلے لگا لیا لیکن گنجے والا نے عجب کام کیا...... وہ اچانک بڈارے کے پاس گیا اور اسے واپس لاتے ہوئے کہا کہ آپ آؤٹ نہیں ہوئے۔

بڈارا حیران رہ گیا۔ ''مجھے ایسا بے ہودہ مذاق بالکل پسند نہیں۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا، آپ واقعی آؤٹ نہیں تھے۔ یہ دراصل ملنگی کی شرارت ہے۔ وہ دیکھو، سامنے ریڑھی والے سے گنڈیریاں کھا رہا ہے۔ اسی نے ایک گنڈیری مار کر آپ کی وکٹ گرا دی تھی۔''

بڈارا گنجے والے کی ایمان داری سے بہت متاثر ہوا اور دوبارہ بیٹنگ کرنے لگا۔ گنجے والا نے آخری گیند اس جوش و خروش سے کرائی کہ اپنے تہبند میں ہی اُلجھ کر گر پڑا۔ بڈارے نے ایک اونچی ہٹ لگائی لیکن خطرے کی بظاہر کوئی بات نہیں تھی۔ دُور دُور تک کوئی کھلاڑی نہیں تھا لیکن اچانک 'آک' کے جھنڈ کے پیچھے سے چھوٹے

''بیماری'' کے بہانے

بچوں کو فرضی بیماریاں بھی بہت لاحق ہوتی ہیں۔ صبح مدرسے جانے سے کچھ دیر پہلے بعض بچے شکایت کرتے ہیں کہ ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ بعض عیار بچے تو واقعی طور پر بیماری کے آثار کا ڈرامائی اظہار ہی کرنے لگتے ہیں۔ عموماً چھٹی کا وقت قریب آتے آتے یہ مرض بھی گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ فرضی بیماریاں امتحان کے دنوں میں تو بہت عام ہو جاتی ہیں۔ ہوم ورک نہ کرنے پر مکتب میں دردِ سر، دردِ کمر، آنکھ میں درد، پیٹ میں درد، طبیعت خراب وغیرہ کے بہانے بنانا، ہمارے بچپن کے زمانہ میں بھی بہت عام تھا۔

بیماری کا بہانہ کرنا زندگی کے تلخ تقاضوں اور ذمہ دار فرائض سے گریز ہے۔ فرار کا یہ طریقہ ست اور لذت پسند بچوں کا بہت پرانا ڈھونگ ہے۔ جس بچے کی تربیت وقت پر کام اور وقت پر کھیل اور راست گوئی کے اصولوں پر ہوئی ہو، وہ محض وقتی راحت اور عیش کے لیے جھوٹے بہانوں میں کبھی پناہ نہیں لیتا۔ ایسا بچہ بالغ ہو کر جفاکش، راست گو، پُروقار، قابل اعتماد اور مفید شہری ثابت ہوتا ہے۔

والا نکلا اور اس نے کیچ تو بڑی آسانی سے لیا لیکن کیچ کے بعد رُکنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ اگر ملنگی نہ پکڑ لیتا تو وہ یقیناً دوسری باؤنڈری سے پار چلا جاتا اور یوں آوٹ کی بجائے چھکا ہو چکا ہوتا۔

آٹھ کھلاڑی آوٹ ہو چکے تھے اور آخری اوور باقی تھا۔ جیتنے کے لیے صرف آٹھ رنز درکار تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان کا ایک ٹاپ کا کھلاڑی فیصل وکٹ پر موجود تھا۔ دانش نے ایک چیلنج کے طور پر آخری اوور لیا اور پھر پہلی ہی گیند پر گنجے والے پر کیچ گیا جو حسبِ معمول اس سے چھوٹ گیا کیوں کہ کیچ کرنا گنجے والا کے بس کی بات نہیں تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ چوکا بھی لگ گیا۔ کھڑکھاند گروپ کے منہ لٹک گئے۔

دوسری گیند پر ایک رنز، اب فتح صرف تین رنز کی دُوری پر تھی۔

تیسری گیند پر...... آوٹ! نو وکٹیں گر چکی تھی۔ آخری وکٹ...... اور تین رنز!

دسویں کھلاڑی نے ایک رنز نکالا اور فیصل وکٹ پر آ گیا۔ ''صرف دو رنز......!'' بڈارا چلایا۔

پانچویں گیند دانش نے بڑی خوب صورتی سے بیٹ کرائی۔ سب کے سانس رُک گئے تھے۔

دانش آیا...... اس نے گیند کی اور ایک زوردار شارٹ...... اگر گیند بہت بلندی پر نہ چلی جاتی تو یقیناً چھکا تھا۔ ایک اُونچا کیچ لیکن وائے قسمت کہ نیچے گنجے والا تھا، سب کے چہرے لٹک گئے۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ بڈارے کے ساتھی دو رنز مکمل کر چکے تھے۔ جشنی ماما اور شاکا بھی گنجے والا کی طرف بھاگے۔ گنجے والا دوڑ کر آگے آیا، پھر چند قدم پیچھے گیا اور پھر اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلا دیئے لیکن گیند سیدھا ان کی کھوپڑی سے ٹکرایا...... اور گنجے والے کے منہ سے 'ہائے' نکل گیا۔ شکر ہے، ٹینس بال تھا، اگر ہارڈ بال ہوتی تو گنجے والے کا جنازہ گراونڈ سے اُٹھتا۔ گیند گنجے والا کے سر سے ٹکرا کر اوپر اُچھلا اور سیدھا جشنی ماما کی طرف گیا۔ جشنی ماما نے کسی فقیر کے کشکول کی طرح اپنی جھولی پھیلا دی۔ گیند سیدھا اس کی جھولی میں گرا اور اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''آوٹ!'' ایمپائر کی پُرجوش آواز گونجی تو سب لوگ ہوش میں آ گئے۔ گنجے والا نے اپنی تکلیف بھول کر جشنی ماما کو کندھوں پر اُٹھا لیا اور 'میلبورن' کا گراونڈ 'پاکستان...... زندہ باد!' کے نعروں سے گونجنے لگا۔

'مین آف دی میچ' کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

یہ اعزاز جشنی ماما کو ملنا چاہیے جس نے ایک مشکل کیچ لے کر میچ جتوایا یا گنجے والا کو، جس نے اپنی گنجی کھوپڑی کی قربانی دی تھی......!!!

☆☆☆

کھوج لگانیے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

حارث علی مان، وار برٹن۔ محمد حمزہ راول پنڈی۔ محمد شفقت سیال، جھنگ۔ احمد ابراہیم حسن، خانیوال۔ احمد ارشاد مغل، لاہور۔ عبدالرحمان بٹ، سیال کوٹ۔ رمشاء امان، لاہور۔ محمد عبداللہ منیب، چکوال۔ محمد قمر الزمان صائم، خوشاب۔ شکیل الرحمٰن، شرق پور۔ عاطف ممتاز، تلہ گنگ۔ علی عبدالباسط، اٹک۔ حافظ احمد محمود، راول پنڈی۔ منیر حسن شاہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ احسان الحق، اسلام آباد۔ رجاء بتول، بورے والا۔ زینب عمران، گوجرانوالہ۔ منزہ فاطمہ، عاتکہ سہیل، لاہور۔ نمرہ افضل، وقاص افضل، جھنگ صدر۔ حفظ الرحمٰن فاروقی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ شریم اشرف غوری، اسلام آباد۔ طہٰ سعادت، سیال کوٹ۔ سحر فاطمہ، فارعہ فہیم، لاہور۔ محمد علی حذیفہ، گوجرانوالہ۔ محمد دانیال اعجاز، سرائے عالم گیر۔ قراۃ العین، سیال کوٹ۔ مہوش اسلم، لاہور۔ محمد سلیمان زیب، کوہاٹ۔ رانا رومان غفور، شیخوپورہ۔ عائشہ مجید، لاہور۔ عبدالسلام، بہاول پور۔ کنزیٰ جدون، ایبٹ آباد۔ مریم احسن، لاہور۔ عبداللہ مسعود، فیصل آباد۔ آمنہ ندیم، جویریہ شعیب، محمد سیف علی مرزا، سید عبید اللہ حسن، رافعہ عمران، لاہور۔ شمسہ امین، نوشہرہ۔ عبدالرحمٰن، راول پنڈی۔ ایقہ فجر ظفر قریشی، میر پور۔ اسامہ راشد، اسلام آباد۔ سعیدہ نسرین، بہاول پور۔ فرید احمد، راول پنڈی۔ رشدہ عدنان، کراچی۔ ردا اقبال، راول پنڈی۔ اسد جاوید، احمد حسین، لاہور۔ فضہ شہزاد، فیصل آباد۔ آمنہ اختر، راول پنڈی۔ احمد علی عبداللہ، میانوالی۔ محمد اسد عارف، کراچی۔ محمد وقاص، پشاور۔ عبداللہ زاہد، فیصل آباد۔ رضوان اشہد، پشاور۔ عائشہ ذوالفقار، عابدہ وردو، لاہور۔ محمد عثمان، علم سکندر، وزیر آباد۔ اذکی عبدالرحمٰن، ازویٰ امان اللہ، لاہور۔ غزالہ امبرین، آباد۔ رضوان اشہد، پشاور۔ عائشہ ذوالفقار، عابدہ وردو، لاہور۔ محمد عثمان، علم سکندر، وزیر آباد۔ اذکی عبدالرحمٰن، ازویٰ امان اللہ، لاہور۔ غزالہ امبرین، مارہ حنیف، بہاول پور۔ حذیفہ مزاری، چتوکی۔ قاری محمد ندیم، اوکاڑہ۔ مریم نعیم، راول پنڈی۔ عبداللہ طارق، فیصل آباد۔ محمد زین العابدین، گوجرہ۔ مارہ حنیف، بہاول پور۔ حذیفہ مزاری، صادق آباد۔ اسامہ خباب علی، چکوال۔ محمد حمزہ لغاری، میانوالی۔ سدرہ رحمان، بہاول پور۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ محمد عثمان حمید، کاموکی۔ سیدہ آمنہ واسطی، کراچی۔ عمر بلال، مریم اعجاز، لاہور۔ ثمینہ رفعت، کظیمہ، احور، عمران، راول پنڈی۔ شازیہ، ثوبیہ، کراچی۔ عبدالمعیز، سیال کوٹ۔ عرفان شیخ، راول پنڈی۔

میری زندگی کے مقاصد

مومل بیگم، لاہور
میں ملک سے دہشت گردوں کا خاتمہ کروں گی۔

نوید اللہ، اٹک
میں بڑا ہو کر پولیس مین بنوں گا اور بزرگوں کا احترام کروں گا۔

حذیفہ احمد، ساہیوال
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا۔

حسن رضا عتیق، فیصل آباد
میں فوجی بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

کومل شہزادی، سرگودھا
میں بڑی ہو کر [illegible] بننا چاہتی ہوں۔ غریب بچوں کو [illegible] سے آشنا کرنا چاہتی ہوں۔

قمر سلیم، کراچی
میں فوجی بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

عمر فاروق یوسف زئی، حیدرآباد
میں دین اسلام کی حفاظت کروں گا۔

مرتضیٰ عطار، کراچی
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں اور ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

طلحہ اقبال، بھکر کوٹ
میں بڑا ہو کر حافظِ قرآن بن کر دین اسلام کی خدمت کروں گا۔

منال سہیل، اوکاڑہ
میں بہترین مسلمان بنوں گی اور اپنے وطن کی حفاظت کروں گی۔

محمد عرفان نواز، روڈا لیہ
میں بڑا ہو کر پولیس آفیسر بن کر جرائم کا خاتمہ کروں گا۔

نور الایمان شہزادی، لاہور
میں بڑی ہو کر پائلٹ بنوں گی اور اپنے وطنِ عزیز کی حفاظت کروں گی۔

محمد سلال خان، ڈیرہ اسماعیل خان
میں آرمی آفیسر بن کر دہشت گردوں کا خاتمہ کروں گا۔

محمد حمزہ ارشد، کراچی
میں فوجی بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

اقصیٰ شہزادی، گجرات
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

حافظ احمد، راولپنڈی
میں فوجی افسر بن کر دہشت گردوں کا خاتمہ کروں گا۔

سمیعہ یوسف، لاہور
میں بڑی ہو کر سائنس دان بنوں گی۔

محمد احمد، اٹک
میں پائلٹ بن کر ماں باپ کا نام روشن کروں گا۔

انشراح عاطف، ڈیرہ غازی خان
میں استانی بن کر بچوں کو مفت تعلیم دوں گی۔

مختصر مختصر

انمول باتیں

☆ حقیقی درد وہ ہے جو دوسروں کے درد کو دیکھ کر محسوس ہو، ورنہ اپنا درد تو جانور بھی محسوس کرتے ہیں۔

ماں

☆ آسمان نے کہا...... ماں صبح کی پہلی کرن ہے۔
☆ چاند نے بتایا...... ماں آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔
☆ ستاروں نے سرگوشی کی ...... ماں ایک روشن ستارہ ہے۔
☆ سورج نے برملا کہا...... ماں کی گود جیسی گرمائش مجھ میں نہیں ہے۔
☆ بادل نے خیال ظاہر کیا...... ماں ساون کے پہلے قطرے کی مانند ہے۔
☆ موسم نے انکشاف کیا...... ماں پیار کی صبح ہے۔
☆ سمندر نے راز بتایا...... ماں ایک کنارہ ہے۔
☆ پھول نے جھوم کر کہا...... ماں ایک خوب صورت خوشبو ہے۔
☆ درخت نے لہرا کر بتایا...... ماں وہ چھاؤں ہے جس کے سائے میں بیٹھ کر سکون ملتا ہے۔

(محمد بلال، کراچی)

پانی پینے کے آداب

☆ پانی بسم اللہ پڑھ کر پینا چاہیے۔
☆ پانی سر ڈھانپ کر پینا چاہیے۔
☆ پانی ٹھہر ٹھہر کر تین سانسوں میں پینا چاہیے۔
☆ پانی کو دیکھ کر اور صاف برتن میں پینا چاہیے۔
☆ پانی پھونک مار کر نہیں پینا چاہیے۔
☆ پانی کھڑے ہو کر نہ پئیں، بیٹھ کر پینا چاہیے۔
☆ پانی پی کر برتن کو اس کی جگہ پر رکھنا چاہیے۔
☆ جراثیم سے پاک اُبلا ہوا پانی پینا چاہیے۔
☆ پانی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اسے ضائع مت کریں۔

(ماریہ عبدالناصر، کلورکوٹ)

دولت سے کیا خرید سکتے ہیں، کیا نہیں......؟

☆ ہم عینک خرید سکتے ہیں، مگر نظر نہیں۔
☆ نرم بستر خرید سکتے ہیں، میٹھی نیند نہیں۔
☆ کتابیں خرید سکتے ہیں، علم نہیں۔
☆ خوشامد خرید سکتے ہیں، محبت نہیں۔
☆ زیور خرید سکتے ہیں، حسن نہیں۔
☆ ادویہ خرید سکتے ہیں، صحت نہیں۔
☆ جسمانی راحت خرید سکتے ہیں، روحانی مسرت نہیں۔

(رومیہ تجمل، لاہور)

باتوں سے خوشبو آئے

☆ ایسی باتیں مت کرو جس سے دوسروں کی دل شکنی ہو۔
☆ ناشکری نہ کرو کیوں کہ یہ گناہ ہے۔
☆ فضول خرچی کی عادت نہ اپنائیں اور کفایت شعاری سے کام لیں۔
☆ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔
☆ خدا کی یاد ہی مسائل کا حل ہے۔
☆ کان، آنکھ، دل سب کے بارے میں باز پُرس ہو گی۔
☆ حق تلفی و ناانصافی ایسے ہی قابلِ نفرت عوامل ہیں جیسے کسی مسلمان کے نزدیک حرام گوشت کا لقمہ۔

(ناظرہ مقدس، شیخوپورہ)

دانائی کی بات

حضرت لقمان کا رنگ گندمی تھا۔ ایک دن بغداد کے بازار سے گزر رہے تھے کہ مفرور غلام سمجھ کر پکڑ لیے گئے اور مٹی کھودنے کے کام پر لگائے گئے۔ ایک شخص اپنا گھر بنا رہا تھا۔ اس نے ایک سال تک آپ سے مٹی کھودنے کی بیگار لی۔ اتفاق سے اس کا غلام اسی اثنا میں لوٹ آیا، وہ حضرت لقمان کو جانتا تھا۔ تڑپ گیا کہ اتنی بڑی شخصیت میری وجہ سے کس مصیبت میں مبتلا ہے۔ قدموں پر گر گیا اور اپنے آقا کو بھی حضرت لقمان کی اہمیت اور شخصیت سے آگاہ کیا تو وہ بھی بڑا پشیمان ہوا۔ حضرت لقمان نے فرمایا: ''بھائی! جو کچھ ہوا سو ہوا، ویسے میں گھاٹے میں نہیں رہا۔ اس مصیبت نے مجھے ایک بڑی دانائی کی بات بتائی ہے کہ شبہ میں کسی غریب کو پریشان نہیں کرنا چاہیے اور یہ سبق بھی سیکھا ہے کہ اپنے غلام سے بھی ہرگز ایسی خدمت نہ لوں گا جیسی مجھ سے لی گئی۔

(شکیل الرحمٰن، شیخوپورہ)

چھانگا مانگا

چھانگا مانگا کا جنگل بہت ہے بڑا
انسانی ہاتھوں سے یہ ہے پھولا پھلا
آیئے اس میں مزید شجر لگائیں
اور اس کے رقبے کو بڑھائیں
اگر یہ جنگل پھولے پھلے گا
پرندوں کو میوہ اور گھر ملے گا
شجر جب بنائیں گے پتوں کی چھتری
مسافر کو سایہ گھنیرا ملے گا
لگائیں گے جتنے شجر ہم زیادہ
ثواب ہم کو اتنا زیادہ ملے گا

(عظیم الرحمٰن صدیقی، لاہور)

سچے دوست کی علامات

حقیقی اور سچا دوست وہ ہوتا ہے جس میں درج ذیل خوبیاں پائی جائیں۔

☆ وہ اپنے دوست کی خامیوں سے واقف ہوتا ہے لیکن دوسروں سے صرف خوبیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔
☆ وہ اپنے دوست کی بات توجہ سے سنتا ہے۔
☆ وہ اپنے دوست کی خوشی اور غم دونوں میں شریک ہوتا ہے۔
☆ وہ دوستی کے تعلق میں بے غرض ہوتا ہے۔
☆ وہ اپنے ہاتھ کو ہمیشہ اوپر والا ہاتھ بنائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔
☆ وہ اپنے دوست کی خامیوں اور کمزوریوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔
☆ وہ ہر دم اپنے دوست سے تعاون کے لیے تیار رہتا ہے۔

کیا آپ کے اندر یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں؟ اگر ہاں، تو یقیناً آپ اچھے اور کام یاب دوست ہیں ورنہ......؟ (اقرا رضا، لاہور)

نماز کی قدر

حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ نمازی کے لیے تین خصوصی عزتیں ہیں پہلی یہ کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے سر سے آسمان تک رحمتِ الٰہی گھٹا بن جاتی ہے، اس کے اوپر انوار بارش کی طرح برستے ہیں۔ دوسری یہ کہ فرشتے اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں اور اسے اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ تیسری یہ کہ ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اے نمازی! اگر تو دیکھ لے تیرے سامنے کون ہے اور تو کس سے بات کر رہا ہے تو خدا کی قسم قیامت تک سلام نہ پھیرے۔ (نازیہ ندیم، راول پنڈی)

دُعا

دُعا کیا ہے؟ دُعا خدا سے ایک مضبوط رشتہ ہے۔ انسان جب بھی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے، وہ خوش ہو کر دیتا ہے۔ اس طرح سے انسان کا خدا سے رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ شکوہ ہی کرتا ہے لیکن اسی بہانے وہ خدا سے ہم کلام تو ہوتا ہے اور جب اس کو بعد میں خبر ہوتی ہے کہ خدا جو بھی کرتا ہے، انسان کی بھلائی کے لیے کرتا ہے تو انسان کا شکر سے سجدہ کرنے کو دل کرتا ہے۔ آپ بھی اپنی دُعاؤں پر پورا بھروسا رکھیے اور خدا سے مانگیے، چاہے چھوٹی سی چیز ہی کیوں نہ ہو۔ (عائشہ صدیقہ، ثمن)

انمول ہیرے ان مول موتی

☆ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے کہو بسم اللہ۔
☆ خدا کے نام پر کچھ دو تو کہو سبیل اللہ۔
☆ کوئی اچھی خبر سنو تو کہو سبحان اللہ۔
☆ جب خوشی محسوس کرو تو کہو فتبارک اللہ۔
☆ کوئی تکلیف پہنچے تو کہو یا اللہ۔
☆ غلط کام پر افسوس ہو تو کہو استغفر اللہ۔
☆ کسی کو رخصت کرنے پر کہو فی امان اللہ۔
☆ کسی کی موت کی خبر سنو تو کہو انا للہ وانا علیہ راجعون۔
☆ پرکھنا چاہو تو ایمان پرکھو۔
☆ پینا چاہو تو اپنے غصے کو پیئو۔
☆ بیٹھنا چاہو تو اچھوں کی صحبت میں بیٹھو۔
☆ کھانا چاہو تو رزقِ حلال کھاؤ۔
☆ کرنا چاہتے ہو تو اپنے والدین کی خدمت کرو۔
☆ لڑنا چاہو تو شیطان سے لڑو۔
☆ دینا چاہو تو خدا کی راہ میں دو۔

(ثروت یعقوب، لاہور)

☆☆☆

کنّا گوشت

اجزاء:

بکرے کا گوشت: آدھا کلو	پیاز، درمیانی: ایک عدد کاٹ کر	ثابت سیاہ زیرہ: ایک چائے کا چمچ	ادرک پیسٹ: تین چائے کے چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر: تین چائے کے چمچ	لہسن پیسٹ: ایک چائے کا چمچ	ہلدی پاؤڈر: آدھا چائے کا چمچ	دھنیا پاؤڈر: دو چائے کے چمچ
گھی: ایک کپ	نمک: ایک چائے کا چمچ	پانی: آدھا کپ	آٹا: ایک کھانے کا چمچ

ترکیب:

مٹکے میں گھی گرم کریں۔ گوشت دھو کر ڈالیں۔ ایک چائے کا چمچ لہسن پیسٹ کو ایک کپ پانی میں حل کر کے ڈالیں۔ دھنیا پاؤڈر، سرخ مرچ پاؤڈر، نمک اور پیاز ڈالیں۔ آدھا گھنٹہ ڈھک کر پکائیں، پھر دو چائے کے چمچ ادرک پسی ہوئی ڈال کر پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو بھون لیں۔ جب گوشت بالکل گل جائے تو ایک کپ پانی ابال کر ڈالیں۔ ایک کھانے کا چمچ آٹے کو آدھا کپ پانی میں حل کر کے ڈالیں۔ جب اُبلنے لگے تو کالا زیرہ ڈالیں، بیس منٹ ہلکی آگ پر پکائیں۔ جب تیل نظر آنے لگے تو چولہا بند کر دیں۔ گرم نان کے ساتھ سرو کریں۔

چائنیز چکن چلیز

اجزاء:

مرغ: آدھا کلو	بند گوبھی: ایک پیالی	گاجر: ایک پیالی
سبز مرچ: بارہ عدد	سویا ساس: دو بڑے چمچ	زیتون کا تیل: حسب ضرورت
سیاہ مرچ، نمک: حسبِ ذائقہ	یخنی: دو پیالی	کارن فلور: دو بڑے چمچ

ترکیب:

گاجر اور بند گوبھی کو باریک کاٹ لیں۔ سبز مرچ درمیان سے چیر دیں اور پیاز کاٹ لیں۔ مرغ کے ٹکڑوں کو تیل میں تل لیں۔ گاجر اور بند گوبھی کو ابال لیں۔ اب مرغ کے ساتھ مرچیں، پیاز اور تمام اشیاء دو پیالی پانی میں ڈال کر پکائیں۔ پانچ منٹ بعد دو پیالی یخنی اور کارن فلور ملا دیں۔ جب گوشت ابل جائے تو اتار لیں۔ دم دے کر سرو کریں۔

میسور

میسور (Mysore) بھارتی ریاست کرناٹک کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ ٹیپو سلطان اسی ریاست کا عظیم و بے نظیر حکمران تھا۔ 16 ویں صدی میں یہ مختصر آبادی والا گاؤں تھا لیکن ہندو مہاراجہ

"N.Vodeyar" کے عہد میں یہ آزاد ریاست کی صورت میں سامنے آیا۔ بعدازاں مسلم حکمرانوں حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان نے میسور ریاست کو علم و ہنر اور فوجی قوت کے اعتبار سے مضبوط بنایا۔ آج میسور بھارت کا اہم شہر ہے جس کی شرح خواندگی 87 فی صد ہے۔ اس شہر کی آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ سیاحت ہے۔ بنگلور کے بعد میسور شہر کمپیوٹر سافٹ ویئر میں دوسرا اہم ترین شہر ہے۔ شہر کے شمالی سمت میں دریائے کاوری "Kaveri" اور جنوبی سمت میں دریائے کبینی "Kabini" بہتے ہیں۔ اس شہر کی تاریخی عمارتیں مشہور ہیں۔ یہاں 1892ء سے چڑیا گھر بھی قائم ہے۔ ٹیپو سلطان کو ''میسور کا شیر'' پکارا جاتا ہے۔ ٹیپو سلطان 4 مئی 1799ء کو دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ آپ کی والدہ کا نام ''فاطمہ'' اور والد کا نام ''حیدر علی'' تھا۔

تمباکو

پوری دُنیا میں ورلڈ نو ٹوبیکو ڈے "World No Tobacco Day" ہر سال 31 مئی کو منایا جاتا ہے کیوں کہ تمباکو نوشی صحت کی

دشمن ہے۔ تمباکو کا سائنسی نام "Nicotiana Tabacum" ہے۔ تمباکو سگریٹ، سگار، حقے اور پان میں استعمال ہوتا ہے۔ اس پودے کا خاندان "Solanaceae" ہے۔ تمباکو دُنیا بھر میں کاشت ہوتا ہے۔ یہ 20 سے 30 سینٹی گریڈ درجۂ حرارت پر خوب نشوونما پاتا ہے۔ تمباکو کے پتے 24 انچ یا اس سے بھی زیادہ لمبے ہوتے ہیں جنہیں خشک کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ تمباکو میں کیمیائی مادہ نکوٹین "Nicotine" پایا جاتا ہے، خاص کر پتوں میں

2 سے 8 فی صد نکوٹین پائی جاتی ہے۔ نکوٹین حشرات مارنے والی ادویات میں استعمال ہوتی ہے۔ تمباکو کا دھواں پھیپھڑوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ تمباکو کی پیداوار میں چین کے بعد بھارت، برازیل، امریکہ اور زمبابوے سرفہرست ہیں۔

خمیر

خمیر (Yeast) کو کہا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کی فنگس (Fungus) ہے جس کا تعلق "Ascomycota" گروپ سے ہے۔ اس کی 1500 اقسام دریافت ہو چکی ہیں۔ یہ یک خلوی جاندار ہیں جن میں نیوکلیئس بھی پایا جاتا ہے۔ یسٹ کے سیل (Cell) کا سائز کئی طرح کا ملتا ہے۔ البتہ سیل کا ڈایا میٹر 3 سے 4 مائیکرون میٹر ہے لیکن کچھ اقسام میں سیل کا سائز 40 مائیکرون میٹر تک جا پہنچتا ہے۔ یسٹ کا سائنسی نام "Saccharomyces Cerevsiae" ہے۔ یہ فنگس تیزابی پی ایچ (Acidic PH) کو پسند کرتی ہے۔ بڈنگ (Budding) کے ذریعے نسل آگے
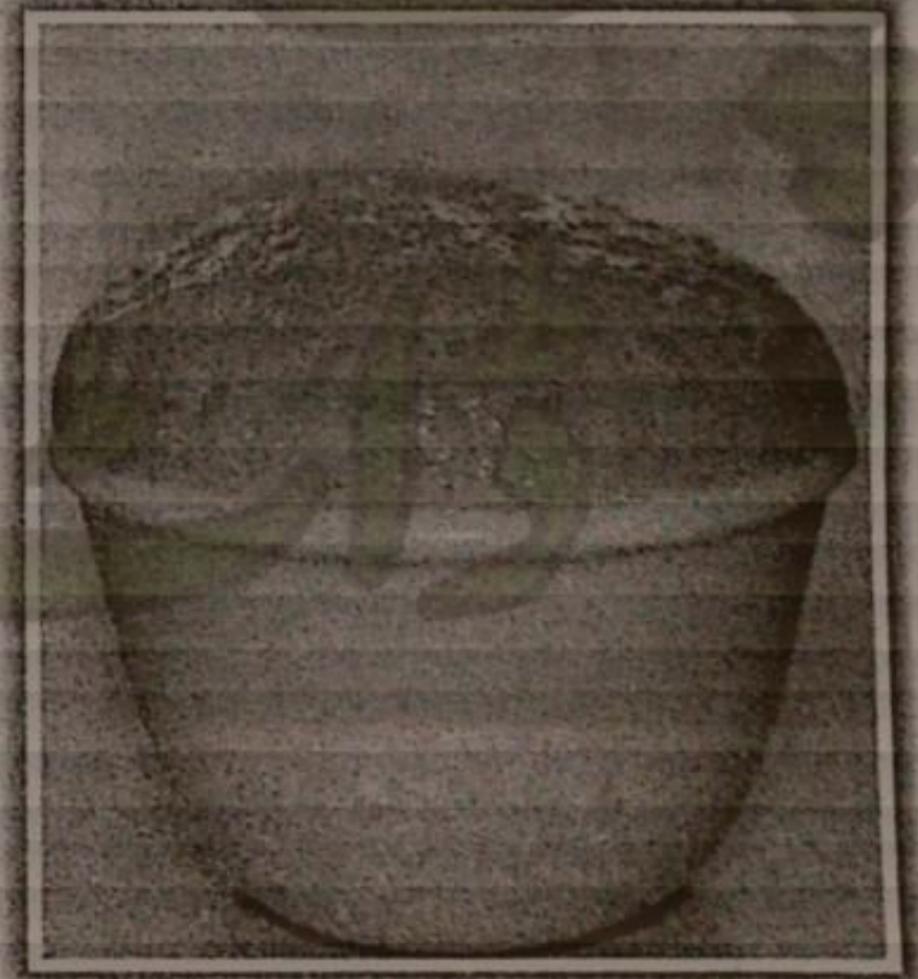
بڑھاتی ہیں۔ یہ فنگس خمیری روٹی، کیک، بن، پیزا، شوارما اور شراب وغیرہ کی تیاری میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ "Dough Nuts" کی تیاری میں بھی یہی فنگس شامل کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف کھانوں کے ذائقے کو بڑھانے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

سونا

سونا (Gold) دُنیا کی مہنگی دھاتوں میں سے ایک ہے جو زیورات کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ لاطینی زبان میں سونے کو

"Aurum" کہتے ہیں۔ اسی لیے گولڈ کی علامت "Au" ہے۔ اس کا ایٹمی نمبر 79 ہے۔ اس دھات سے حرارت اور کرنٹ بآسانی گزر جاتے ہیں۔ سونا فلورین، پوٹاشیم وغیرہ کے ساتھ کیمیائی عمل کرتا ہے۔ سونا ہلکا سرخی مائل پیلا ہوتا ہے۔ یہ دھات سکّے، بت، مینار و گنبد وغیرہ کی تیاری میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ سونے کے اجزاء ادویات، سگریٹ کی پنی، کچھ مٹھائیوں اور سجاوٹ کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ دُنیا میں سونے کا پہلا سکہ 600 قبل مسیح متعارف کروایا گیا تھا۔ ہر سال دُنیا بھر میں چٹانوں سے ہزاروں ٹن سونا نکالا جاتا ہے۔ چین، جنوبی افریقہ، گھانا، مالی، انڈونیشیا اور ازبکستان سونا نکالنے والے بڑے ممالک ہیں۔ مختلف کھیلوں کے مقابلے میں بھی سونے کے تمغے انعام میں دیئے جاتے ہیں۔ بھارت، چین، امریکہ، ترکی اور سعودی عرب سونا استعمال کرنے والے بڑے ممالک ہیں۔ ☆☆☆

داؤدی علمی آزمائش

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے پردادا کا کیا نام تھا؟

i۔ قیدار ii۔ ہاشم iii۔ نفیس

2۔ علامہ اقبال کا شعر مکمل کیجیے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ....

3۔ وہ جگہ جہاں کسی قسم کا مادہ نہ ہو، کیا کہلاتی ہے؟

i۔ پہاڑ کی چوٹی ii۔ خلاء iii۔ سمندر کی تہہ

4۔ قرآنِ کریم کی حفاظت کا ذمہ کس نے اُٹھایا ہے؟

i۔ نبی اکرمؐ ii۔ اللہ تعالیٰ iii۔ فرشتے

5۔ فائر پروف اور واٹر پروف کاغذ کس نے ایجاد کیے؟

i۔ نیوٹن ii۔ جابر بن حیان iii۔ آئن سٹائن

6۔ گنجے پن کی بیماری کس حیاتین کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے؟

i۔ وٹامن بی ii۔ وٹامن ایچ iii۔ وٹامن ڈی

7۔ کرکٹ بیٹ کی چوڑائی کتنی ہوتی ہے؟

i۔ چار انچ ii۔ سوا چار انچ iii۔ ساڑھے چار انچ

8۔ پاکستان کا کون سا شہر ٹیلی فون انڈسٹری کی وجہ سے مشہور ہے؟

i۔ ہری پور، ہزارہ ii۔ ٹیکسلا iii۔ گجرات

9۔ 3 جون 1947ء کو ریڈیو سے پہلی بار کس شخصیت نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا؟

i۔ لیاقت علی خان ii۔ مولانا ظفر علی خان iii۔ قائدِاعظم

10۔ نجہ سنج عربی کا لفظ ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

i۔ گننے والا ii۔ تسبیح پڑھنے والا iii۔ تلاوت کرنے والا

جوابات علمی آزمائش اپریل 2015ء

1۔ لال بیگ 2۔ سورۃ المریم 3۔ چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

4۔ سورۃ الناس 5۔ چاندی 6۔ آلٹی میٹر 7۔ سوڈیم سیلیکیٹ

8۔ انٹارکٹیکا 9۔ 1817ء 10۔ زین یار جنگ

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ حفصہ بنت آصف، پشاور (150 روپے کی کتب)

☆ سنیہ وجیہہ ضیغم، پشاور (100 روپے کی کتب)

☆ مریم رضوان، راول پنڈی (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: احمد ارشاد مغل، لاہور۔ احسن افضل، جھنگ صدر۔ محمد اکرم صدیقی، ہرنولی۔ لائبہ طارق، فیصل آباد۔ حذیفہ مزاری، صادق آباد۔ مریم نعیم، راول پنڈی۔ مائرہ حنیف بہاول پور۔ اخلاق احمد، فیصل آباد۔ وردہ زہرہ، طوبیٰ زہرہ، جھنگ صدر۔ اسامہ خباب علی، چکوال۔ محمد عثمان حمید، کاموکے۔ مریم اعجاز، لاہور۔ احمد ابراہیم حسن، لاہور۔ محمد سلیمان زیب، کوہاٹ۔ احمد عبداللہ، ملتان۔ محمد شادمان صابر، لاہور۔ عزت مسعود، فیصل آباد۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ حارث علی مان، واربرٹن۔ اریبہ ثمرین، عبدالجبار، شہزادی خدیجہ شفیق، رافیہ عمران، سید عبداللہ حسن، لاہور۔ محمد حمزہ، راول پنڈی۔ محمد شفقت سیال، جھنگ۔ حافظہ عائشہ سمیع، کراچی۔ محمد اسحاق، پشاور۔ کشف طاہر، فجر خان، نوشہرہ۔ رضوان اشہد، عائشہ ذوالفقار، لاہور۔ محمد قمر الزمان صائم، خوشاب۔ ناظرہ مقدس، شرقپور۔ سیرت فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان۔ عاطف ممتاز، تلہ گنگ۔ علی عبدالباسط، اٹک۔ احمد بن طاہر، منڈی بہاؤ الدین۔ اذکی تحریم، میانوالی۔ ماریہ نوید، سارہ خالد، فیصل آباد۔ محمد شوال ندیم، اوکاڑہ۔ اسد جاوید، لاہور۔ عبید اسماعیل، راول پنڈی۔ محمد قاسم، لاہور۔ معوذ الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ محمد علی حذیفہ، گوجرانوالہ۔ اظہر عباس، چنیوٹ۔ ثانیہ طلعت، سیال کوٹ۔ حفصہ اعجاز، صوابی۔ عشاء نور، سیال کوٹ۔ انیقہ فجر ظفر قریشی، میر پور آزاد کشمیر۔ معززہ فاطمہ، ڈیرہ غازی خان۔ عدن سجاد، جھنگ۔ محمد احمد جواد، چشتیاں۔ صفی الرحمٰن، لاہور۔ محمد ہارون آصف، واہ کینٹ۔ مشعال آصف، لاہور۔ زوبیہ احمد، کراچی۔ محمد الریان، گجرات۔ عرشیہ شہزاد، گوجرانوالہ۔ تہنیت فاطمہ، رحیم یار خان۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ حافظ محمد منیب، وزیر آباد۔

ٹیپو سلطان کی وصیت

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول !

لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول !

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز !

ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول !

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں !

محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول !

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیلؑ نے

جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول !

باطل دُوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے

شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول !

علامہ اقبالؒ نے سلطان ٹیپو شہید کی زبانی عاشقِ حق کی شان بیان فرمائی ہے کہ وہ اپنے نصب العین کو نگاہ میں رکھتا ہے اور دُنیا کی دلچسپیوں کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اس کا دل عقل کا غلام نہیں ہوتا اور وہ ہر قسم کے خطرات سے بے نیاز ہو کر ہر حال میں اپنے فرض کی بجا آوری کو مقدم رکھتا ہے۔ اس کی زندگی حق کے لیے وقف رہتی ہے اور وہ کسی بھی مرحلے پر حق کے ساتھ باطل کو شریک نہیں کرتا۔

اُس کی محنت قابلِ دید تھی۔ وہ اپنی نئی چمچماتی گاڑی کو اور چمکانے میں مصروف تھا۔ دیکھا جائے تو یہ کام وہ خوامخواہ کر رہا تھا، اس نے یہ گاڑی تین دن قبل ہی تو خریدی تھی۔ ابھی تو کمپنی کے کیے ہوئے رنگ پر گرد کا کوئی نشان بھی نہیں آیا تھا لیکن وہ اس کو پھر بھی کپڑے سے صاف کرنے میں خوشی محسوس کر رہا تھا۔

اچانک ہی وہ چونک گیا۔ اس کو اپنے پیچھے تیز قدموں کی آواز محسوس ہوئی۔ یہ ایک فرد کے قدموں کی آواز ہوتی تو وہ پریشان نہیں ہوتا لیکن تین چار افراد کی آمد کا اشارہ تھا۔ ان کی آپس کی آوازوں نے اُسے ایک انداز سے خوف زدہ کر دیا تھا۔ جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے اندر کے خدشات کچھ سچ ہوتے نظر آئے۔

وہ چار افراد تھے جو بے حد مشتعل نظر آ رہے تھے۔ ان کے عزائم کچھ اچھے نہ تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں تھیں۔

''کک...... کیا بات ہے ایسے کیوں اندر چلے آئے؟''

وہ اپنے گھر سے ملحقہ گیراج میں تھا، اس لیے ان کا بغیر اجازت داخل ہونا کسی خطرے کا سبب تو بہر حال تھا۔ انہوں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے عملی اقدام اُٹھایا جو اس کے حواس اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ ان چاروں کی ہاکیاں بلند ہو چکی تھیں اور ان کا رُخ اس کی نئی چمچماتی کار کی طرف تھا۔ اس کو غش سا آنے لگا۔ اگر وہ ان کو روکنے کی کوشش کرتا تو ہو سکتا ہے کہ پہلے وہ اس پر حملہ آور ہو جاتے۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے جب کہ وہ کار کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ☆

''یہ کوئی موٹر سائیکل ہے!'' اس نے لات مار کر اس موٹر سائیکل کو گرا کر کہا۔ گاڑی گلی کے درمیان میں جا گری۔ اس کے ابو ایک دم پریشان ہو گئے۔ انہوں نے پکڑ کر اسے گاڑی کی جانب کرنے کی کوشش کی جب کہ انصار اس طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

''تم اس گاڑی کو دیکھو تو سہی بیٹا!''

''نہیں! مجھے ایسی بے سُری گاڑی بالکل بھی نہیں چاہیے۔'' انصار نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اسے چلا کر تو دیکھو تم! بے حد اچھی ہے، تم اس کی صورت پر مت جاؤ۔'' انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہونہہ...... صورت!'' اس نے انتہائی نخوت سے کہا۔ اس کے والد اس کی شکل دیکھتے رہ گئے۔ اپنے گھمنڈ میں اس نے گاڑی کو چلانا تو کجا ہاتھ لگانا بھی پسند نہ کیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کس طرح بارہ ہزار روپے خرچ کر کے انہوں نے اس کی خواہش پوری کرنے کوشش کی لیکن اس نے گاڑی روڈ پر چھوڑی اور ایک طرف چلا گیا۔ انصار صاحب نے گاڑی اُٹھائی اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل دیے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ گاڑی وہ خود چلائیں گے۔ ☆

اُن چاروں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کی گاڑی پر ہاکیوں سے وار شروع کر دیا۔ ان میں سے دو کار کے اگلے حصے میں اور دو نے

پچھلی جانب حملہ کیا۔ ایک نے ہیڈ لائٹس توڑیں تو دوسرے نے بونٹ پر اسنک ماری۔ وہ بھنا کر رہ گیا۔ اس نے ایک حملہ آور کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچنے کی کوشش کی تو اُس نے پوری طاقت سے اُسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ غصے سے پھر اُٹھا تو ایک نے ہاکی اس کی کمر پر رسید کی۔ اگلی کوشش پر اسنک شدت کے ساتھ اس کے سر پر پڑی۔

"میرا قصور کیا ہے؟" وہ اپنی نئی نویلی کار کے ساتھ ہوتا ظلم دیکھ کر چلا اُٹھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا' اسے کوئی ایسی اُمید تو نہیں تھی کہ وہ ایسے کسی حملے سے بچنے کا کوئی بندوبست کر کے رکھتا۔

"تم ہو ہی اسی لائق......" ایک نے زور سے کہا اور وہ چاروں پھر کار کا حلیہ بگاڑنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کی اگلی کوشش میں ان چاروں نے اسے اچھی طرح مارا اور پھر گاڑی کی توڑ پھوڑ میں مصروف ہو گئے۔ جب وہ اچھی طرح اپنا غم وغصہ نکال چکے تو جانے کے لیے مُڑے۔ وہ زخمی ہو کر زمین پر گر چکا تھا۔

"تم نے اسی کار سے پرسوں ہمارے دوست کو بُری طرح زخمی کیا تھا۔" ان میں سے ایک بولا۔

"ہم نے تم سے اپنے دوست کا بدلہ لے لیا ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"جس گاڑی کو تم بھگاتے ہوئے لے گئے تھے' ہم نے اس کا حشر نشر کر دیا ہے۔" تیسرے نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو شکر کرو کہ ہم تمہیں زندہ چھوڑے جا رہے ہیں۔" چوتھے نے ایک بار پھر کار پر اسنک ماری اور پھر یہ چاروں دوڑ کر اس کے گیراج سے نکلتے چلے گئے۔

وہ زخمی حالت میں بائیس لاکھ کی لاگت سے خریدی ہوئی گاڑی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جو تین ہی دن میں اس کے لیے وبال بن گئی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں حادثے کا وہ منظر گھوم گیا جو دو روز قبل کر کے وہ فرار ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا لیکن یہ محض اس کی خام خیالی تھی۔ زخم کی شدت سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ☆

"امی! میں ایسی بے کار موٹر سائیکل قطعی نہیں لوں گا۔" اپنے والد کا دل توڑنے کے بعد وہ اپنی والدہ کی گردن میں بانہیں ڈال کر لاڈ کا اظہار کر رہا تھا۔

"بیٹا! تمہارے ابو کی جو گنجائش تھی، اس کے مطابق انہوں نے تمہارے لیے موٹر سائیکل لے دی۔ اب تم اس سے کام چلاؤ۔" انہوں نے بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ انصار ہی کیا جو کسی کی بات سمجھ جائے۔ وہ بے چاری اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ ☆

اس کو ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔ اس کے سر اور ہاتھ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کا کافی خون ضائع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے خون کی بوتل بھی لگا دی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس کے کسی پڑوسی نے دروازے سے بہتا خون دیکھ کر فوری مدد کے لیے رجوع کیا تھا اور اسے بے ہوشی کی حالت میں بروقت اسپتال لے آئے تھے۔ خون اور بہتا رہتا تو حالت خطرے میں بھی ہو سکتی تھی۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اچانک سر میں درد کی ٹیس اُٹھی اور اس نے پھر سر تکیے سے ٹکا دیا۔

"بھائی صاحب! ہلنے کی کوشش نہ کرو۔" نرس نے اس کے ہاتھ میں لگی خون کی نلکی کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی دو روز تک تم بالکل نہیں ہلو گے۔" اس نے اسے سمجھایا۔

اس کے جواب میں اس کے ہونٹوں نے صرف جنبش کی۔ اس کی آواز حلق سے نہ نکل سکی۔

"تمہارے ایکسریز بھی لینے ہیں، ہڈیوں کو چیک کرنا پڑے گا۔ خدانخواستہ......" اس نے افسردگی سے کہا۔ "حملہ آوروں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔"

اسے اس جوان کی ایسی حالت پر افسوس بھی تھا۔ وہ نرس کی باتیں سنتے سنتے پھر نیند کی وادی میں کھو گیا۔ ☆

"میرے پاس حلال کی کمائی ہے اور اس میں ایسی ہی موٹر سائیکل دلا سکتا تھا۔" وہ اپنے والد سے مستقل تکرار کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے والد اسے نئے ماڈل کی گاڑی دلا دیں اور وہ اسے اپنی مجبوری سمجھانے کی کوشش میں مصروف تھے مگر وہ سمجھے تو......

"آپ کی دولت اگر ہمارے ہی کام نہ آئی تو پھر کس کے کام آئے گی۔" وہ اپنے والد کو زیرِ بار کرنا چاہتا تھا۔

"تم نے کہاں دیکھ لی ہے میری دولت۔" وہ روہانسے ہو کر بولے۔ بچہ جوان ہونے لگے تو والدین کتنے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ انہوں نے بارہ ہزار بھی کس طرح جمع کیے تھے' وہ ہی جانتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے نئی گاڑی لے کر دی جائے۔

"آپ چاہیں تو وہ دکان بیچ سکتے ہیں جو آپ نے تیس ہزار کی لی تھی اور اب وہ تین لاکھ کی ہو چکی ہے۔"

اس نے اپنے والد کو اُلٹا مشورہ دیا۔

"تم تو ہو احمق، اس دکان سے تین ہزار ماہوار کرایہ آتا ہے۔ اس سے ہمارے بجلی گیس کے بل ادا ہو جاتے ہیں۔" وہ غصے سے

بولے۔ ''تم چاہتے ہو تمہاری فضول خواہشات کو پورا کرنے کے لیے میں اپنی جائیداد بیچ دوں۔''

وہ بار بار انہیں غصہ دلاتا رہا اور وہ پریشان ہوتے رہے لیکن انصار کسی طرح بھی نہ مانا اور اس نے اس گاڑی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس کی والدہ نے اپنے شوہر کو سمجھانا چاہا لیکن وہ ان کی مجبوری بھی جانتی تھی، اس لیے کہہ سن کر خاموش ہوگئی۔

اس کے اور والد کے درمیان ایک سرد جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ انہیں باپ کا مقام دینے کو تیار نہ تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ اسے ہر طرح کی من مانی کرنے کی اجازت دی جائے۔ گویا وہ ان کا باپ بننے کو تیار تھا اور یہ کسی طور اس کے والد کو گوارہ نہ تھا۔ اس کے والد اسے جس سمت لے جانا چاہ رہے تھے، وہ اس پر چلنے کے لیے تیار نہ تھا۔

اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ کسی طور ایسے گھر میں نہیں رہے گا جہاں اس کی خواہشات کا احترام نہیں کیا جاتا، اس کے دل کے ارمان پورے نہیں کیے جاتے۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ کسی طور اڑ کر کسی اور ملک پہنچ جائے جہاں محنت کر کے کمائے اور اس کے پاس گاڑی، بنگلہ اور زندگی کی دیگر مراعات ہوں لیکن باہر جانے کے لیے بھی اچھی خاصی رقم اور ہنر کی ضرورت تھی اور یہ دونوں اس کے پاس نہ تھے۔

انٹر اس نے محنت سے پاس کر لیا تھا۔ وہ آگے پڑھتا بھی رہا اور ملازمتوں کے لیے انٹرویوز دینا بھی شروع کر دیے۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ اسے یو ڈی سی کی ملازمت چند انٹرویوز کے بعد مل گئی۔ مزید یہ کہ وہ ایک ایسی سیٹ پر بیٹھ گیا جہاں اس سے کام کرانے کے لیے لوگوں نے مال دینا شروع کر دیا۔ افسرانِ بالا کی رضامندی کے ساتھ اس کا کام چل نکلا۔ وہ دن بدن اپنا بنک بیلنس بڑھانے لگا۔ باپ کے اعتراضات سامنے آئے تو اس نے سرکاری فلیٹ لے کر وہاں جا کر رہنا شروع کر دیا۔ اپنی زندگی کے معاملات وہ خود سرانجام دینے لگا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اس کے والدین اس کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ ہیں، وہ الگ رہ کر اپنا خوش گوار مستقبل بنائے گا۔ اس کے والد کا یہ کہنا تھا کہ تم جہنم کا ایندھن خرید رہے ہو جو ہمارے لیے بھی بدبختی کا سبب بنے گا۔

اس نے اپنی والدہ سے رابطہ رکھا۔ ان کی مالی مدد کی کوشش کی لیکن وہ اس معاملے میں اپنے شوہر کی ہم نوا تھیں۔ انہوں نے اس کی رقم یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ انہیں حرام کے ایک لقمے کی بھی تمنا نہیں ہے۔

اپنی پسند کی شادی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی مرضی کا گھر بناتا رہا۔ رشوت کی رقم سے کبھی پردے تو کبھی قالین اور کبھی ایئر کنڈیشن خریدتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔ اس نے جب نئی موٹر سائیکل لی تھی تو جان بوجھ کر اپنے والد کے کیبن کے آگے سے کئی بار پریشر ہارن بجا کر گزاری تھی اور یہ باور کرایا تھا کہ تم نے جو کام نہیں کیا وہ میں نے خود کر لیا ہے۔ اس کے والد سوائے کڑھنے کے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ انصار کا اگلا ٹارگٹ کار تھی۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ مارتا رہا اور رقم پس انداز کرتا رہا۔ دونوں میاں بیوی جلد از جلد گاڑی لے لینا چاہتے تھے۔

کار کے معاملے میں بھی اس نے یہی سوچ رکھی تھی کہ وہ لے گا تو نئی کار۔ جب اس نے پندرہ لاکھ جمع کر لیے تو اس کا شوق انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ گاڑی بائیس لاکھ کی تھی۔ اب اس سے صبر نہ ہوا تو اس نے اپنا پچھلے سال خریدا ہوا فلیٹ بھی بیچ دیا۔ اس نے سوچا کہ کچھ عرصے کرائے پر رہ لوں گا، پھر کوئی بڑا مال ہاتھ لگ گیا تو مکان بھی لے لیں گے۔

اسے کیا معلوم تھا کہ رشوت کا مال جمع کر کے اس نے جو گاڑی خریدی ہے، وہ زیادہ عرصہ اس کا ساتھ دے گی بھی کہ نہیں۔ اگلے ہی دن تیز رفتاری کے باعث وہ ایک نوجوان کو شدید زخمی کر بیٹھا اور دو روز بعد اس نوجوان کے ساتھیوں نے نہ صرف اسے زخمی کیا بلکہ اس کی گاڑی کا حلیہ بھی بگاڑ گئے۔ ☆

''تم نے کتنے سال لگا دیے مالِ حرام جمع کرنے میں...... اور ہوا کیا......؟''

اس کے والد نے اس سے کہا تو وہ منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن اس کی آنکھوں سے ایک سیلِ آب رواں ہوگیا۔

''میں نے آپ کو بہت ستایا ہے ناں ابو!'' اس کو اپنے تمام جرم یاد تھے۔

''مجھے تمہاری اس حالت پر بے حد افسوس ہے بیٹا!'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ''اللہ تمہیں صحت دے۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس کی امی نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا۔ کچھ دیر پہلے تک اسے جو زخم انگارے لگ رہے تھے، اب پھول بن چکے تھے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس نے کئی سال حرام کما کر جو کچھ جمع کیا، وہ اس کے کیا کام آیا۔

''اب میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جو میرے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے خلاف ہو۔ اب والدین کو ستاؤں گا، نہ ہی رشوت خوری کر کے اپنے آپ کو گناہ گاروں کی صف میں شامل کروں گا۔'' یہ اس کی توبہ تھی اور ہر مسلمان کو یہ یقین ہے کہ سچے دل سے، وقت پر کی گئی توبہ ضرور قبول ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

زبیدہ سلطانہ

محاورہ کہانی

اُونٹ کے منہ میں زیرہ

ندا بارش میں بھیگتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تو اسے پکوان تلنے کی خوشبو آئی۔ وہ مارے خوشی کے بے تحاشا دوڑتی ہوئی اندر آئی اور کتابیں میز پر رکھ کر کچن کی طرف بھاگی۔ دروازے میں ماما سے ٹکراتی بچی تو سامنے پڑی ٹرالی سے جا ٹکرائی۔ تین چار برتن فرش پر لڑھک گئے۔ ''امی جی!...... السلام علیکم! کیا پکا رہی ہیں؟'' وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔

''وعلیکم السلام! جیتی رہو...... تحمل تو کرو، اتنی بدحواس کیوں ہو گئی ہو؟'' ماں نے ہنس کر کہا۔

''کیسی اچھی خوشبو آ رہی ہے...... کیا بنا رہی ہیں؟'' ندا نے پھر پوچھا۔

''اتنے دنوں بعد بارش ہوئی ہے، اسی خوشی میں میں نے سوچا کہ تم بچوں کے لیے پوڑے بنا لوں۔'' امی نے کہا۔

''تو کیا بن گئے؟ دکھائیں ذرا......'' وہ بے صبری سے بولی۔ منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

''چھوٹی بہن اور بھائی کو بھی آ لینے دو، پہلے جا کر یونی فارم بدلو، منہ ہاتھ دھولو!'' امی نے خفا ہو کر کہا۔

''نہیں امی...... پہلے چکھا تو دیں تھوڑا سا۔'' ندا نے ضد کی۔

''ہائے ہائے لڑکی! کیا ہو گیا ہے تجھے، اونٹ جتنی لمبی ہو گئی ہے مگر عقل نہیں آئی!'' امی خفا ہوئیں۔

''ممی اونٹ بے چارے کو بہت بھوک لگی ہے، ایک پوڑا دے دیں ناں؟'' اس نے امی کی منت کی تو انہوں نے ایک چھوٹا پوڑا نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا۔ ندا نے اس کا ایک ہی نوالہ بنایا اور خالی پلیٹ پھر ماں کے آگے بڑھاتے ہوئے بولی:

''یہ ذرا سا نوالہ تو ایسے ہے جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ ڈال دیا ہو، کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کیا کھایا؟'' یہ سن کر امی کو ہنسی آ گئی۔

''تم نے مان لیا کہ سچ مچ کی اونٹ ہو، مگر اب سب کا حصہ نہ چر جاؤ، یہ لو اپنے حصے کے پوڑے، اب انہیں بھی زیرہ نہ بنا لینا، جاؤ آرام سے میز پر جا کر کھاؤ۔'' امی نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ انہیں اس کی یہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات بہت پسند آئی۔

دراصل جب بھی کسی کو اس کی جسامت اور عمر کے لحاظ سے کم چیز ملتی ہے تو یہی ضرب المثل کہی جاتی ہے۔ ☆☆☆

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

دادی جان بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے باوجود بہت چاق و چوبند رہتی تھیں۔ وہ بہت نرم دل اور خوش مزاج بھی تھیں۔ فارغ وقت میں بہو کا ہاتھ بھی بٹاتیں اور چھوٹے بچوں کا خیال رکھتیں۔ گھر کے سب بچے ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کے پاس ہر وقت کھانے پینے کی چیزیں رکھی رہتیں جو وہ اکثر بچوں کو بانٹ دیتی تھیں۔

ایک دن حسب معمول دادی جان تخت پوش پر بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے پھل اور سبزیاں بھی رکھی تھیں۔ اب بچے بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ دادی جان نے بچوں کو دماغی ورزش کے لیے آزمائش میں ڈال دیا۔

"سنو بچو! اگر آپ نے میری پہلی بات بتا دی تو انعام میں آپ کو پھل دوں گی۔" سب بچوں نے خوش ہو کر کہا۔ "ضرور، ضرور! ہم سوچ کر بتائیں گے۔" "تو سنو!

میں ایک پھل ہوں کھٹا میٹھا — بچے شوق سے کھاتے ہیں
آخری دونوں حرف مٹا کر — سبزی مجھ کو بناتے ہیں

یہ سنتے ہی بچوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ سوچنے لگے۔ آپ کے منہ میں بھی پانی بھر آیا......؟ آپ جلدی سے سوچ کر بتائیں۔

اپریل 2015ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے" کا صحیح جواب یہ ہے:

چار روپے کی 80 چڑیاں، 95 روپے کے 19 تیتر اور ایک کبوتر ایک روپے کا ہوگا، لہٰذا 100 پرندے 100 روپے میں ہو گئے۔

اپریل 2015ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- اظہر عباس، بھوانہ
2- نفیسہ فاطمہ قادری، کاموکی
3- محمد احمد خان غوری، بہاول پور
4- فیصل گلزار، گوجرانوالہ
5- حاجرہ یوسف، بنوں

بوجھو تو جانیں

1- چار پائے ایک سوار
پیچھے بندے بے شمار

2- بڑی جائے ایک بار
چھوٹی جائے بار بار

3- پھوٹی قسمت پھوٹے بھاگ
گری بھی تاپے آگ

4- جیسے اُس کا آنا اچھا
ویسے اُس کا جانا اچھا
چپ رہ کر تم اسے بلاؤ
باتیں کر کے اسے بھگاؤ

5- چار ہیں رانیاں ، ایک ہے راجا
ہر اک کام ہے ان کا ساجھا

6- صدیوں کا ہے اک گلزار
پھول ہیں جس کے بے شمار

7- چار ایسے بھی سلطان
جن کا محل نہ مکان
جن کا نوکر نہ دربان
جن کا سکہ نہ فرمان

8- پاؤں نہیں پھر بھی رواں ہے
کبھی یہاں تو کبھی وہاں ہے

(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

9- ایک پھل کے سر پر تاج
سوچ سمجھ کر بتاؤ میرے لال

(ارفع خالق)

راستہ بتاؤ!

ننھے حمید کو اس کے ابا نے ایک خط لینے ڈاک خانے بھیجا ہے مگر اسے راستہ معلوم نہیں۔ کیا آپ اسے راستہ بتا سکتے ہیں؟

آئیے مسکرائیے

پہلا آدمی (دوسرے سے): ''میں موسم سرما میں کوئی کام نہیں کرتا۔''
دوسرے نے پوچھا: ''اچھا تو پھر تم موسم گرما میں کیا کام کرتے ہو؟''
پہلا آدمی: ''موسم سرما کے آنے کا انتظار۔'' (محمد شکیب، بہاول پور)

ایک دوست (دوسرے سے): ''کاش میں وقت ہوتا، لوگ میری بڑی قدر کرتے۔ ہر شخص میرا غلام ہوتا، لوگ میرے پیچھے بھاگتے لیکن میں کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔''
دوسرا دوست: ''اگر تم وقت ہوتے تو لوگ دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتے۔''
پہلا دوست: ''وہ کیوں؟''
دوسرا دوست: ''لوگ کہتے ہٹ جاؤ بھائی! دیکھو کتنا بُرا وقت آ رہا ہے۔''
(شانزے شاہین، بہاول پور)

ٹیچر: ''اے بی سی سناؤ۔''
لائبہ: ''اے بی سی۔''
ٹیچر: ''اور سناؤ!''
لائبہ: ''اللہ کا شکر ہے آپ سنائیں۔'' (سید محمد موسیٰ)

بس میں سفر کے دوران ایک لڑکے کا ہاتھ ایک آدمی کی جیب سے ٹکرا گیا۔ وہ آدمی غصے سے بولا: ''تم کیا کر رہے ہو؟''
لڑکا معصومیت سے بولا: ''جی میں میٹرک کر رہا ہوں۔''
(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

ماں نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: ''یاد رکھنا بیٹا، ہم اس دُنیا میں لوگوں کی بھلائی کے لیے آئے ہیں۔''
بیٹا (ماں سے): ''اور لوگ دُنیا میں کیوں آئے ہیں؟'' ☆

ایک دن ملا نصیر الدین نے سوچا کہ اخروٹ توڑ کر کھائیں۔ انہوں نے اخروٹ پر پتھر مارا تو وہ اُچھل کر غائب ہو گیا۔
ملا مسکرا کر بولے: ''ہر چیز موت سے بھاگتی ہے۔'' (ثنا مراد، کراچی)

طلحہ: ''مجھے انگریزی کے پروفیسر بہت پسند ہیں۔''
عمر: ''اس کی کوئی خاص وجہ؟''
طلحہ: وہ کلاس میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مجھے کلاس سے باہر نکال دیتے ہیں۔ ☆

سپاہی (افیمی سے): ''تم سڑک پر نشے میں دھت پڑے ہو، فوراً میرے ساتھ تھانے چلو۔''
افیمی: ''اگر مجھ میں چلنے کی ہمت ہوتی تو گھر نہ چلا جاتا۔'' (ظل ہما، لاہور)

اُستاد (شاگرد سے): ''وہ کون سی چیز ہے جسے سونگھ کر آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے؟''
شاگرد: ''سر! میرے بڑے بھائی کے موزے۔'' ☆

ایک صاحب نے پہلوان سے پوچھا: ''تم ایک وقت میں کتنے آدمی اُٹھا سکتے ہو؟''
پہلوان نے فخریہ انداز میں جواب دیا: ''کم سے کم دس آدمی۔''
''بس؟ تم سے اچھا تو ہمارا مرغا ہے جو صبح صبح پورے محلے کو اُٹھا دیتا ہے۔'' ☆

ایک شخص کو کرائے کا مکان چاہیے تھا۔ وہ اسی سوچ میں گم دریا کے کنارے پہنچا، جہاں اسے ایک تربوز ملا۔ اس نے اسے کاٹ کر دو ٹکڑے کیا تو تربوز کے اندر سے جن برآمد ہوا اور اس نے کہا:
''کیا حکم ہے میرے آقا......؟''
اس شخص نے کہا: ''مجھے کرائے کا مکان چاہیے۔''
جن نے کہا: ''مجھے کرائے کا مکان ملتا تو میں تربوز کے اندر کیوں رہتا۔'' (احور رانا کامران، لاہور)

آدمی (بھکاری سے): ''گھر گھر جا کر تمہیں بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی؟''
بھکاری: ''کیا کروں، میرے گھر آ کر کوئی بھیک دیتا ہی نہیں۔'' ☆

مالک (نوکر سے): ''جاؤ بازار سے سبزی اور پھل لے آؤ اور دیکھو دیر نہ لگانا، بجلی کی طرح جانا اور بجلی کی طرح آنا۔''
نوکر (معصومیت سے): ''لیکن بجلی تو جا کر کئی کئی گھنٹے واپس نہیں آتی۔'' ☆

ایک مکھی کسی گنجے کے سر پر بیٹھی تو دوسری مکھی نے پوچھا: ''تم نے اتنا بڑا گھر بنا لیا؟''
پہلی مکھی نے جواب دیا: ''ابھی گھر کہاں بنایا، ابھی تو صرف پلاٹ خریدا ہے۔'' (کظیمہ زہرہ، لاہور)

کسی بھی چیز کی معیاد (ایکسپائری ڈیٹ) جب پوری ہو جائے یا ختم ہونے کے قریب ہو تو ہر کوئی اس کو استعمال کرنے یا چیر پھاڑ کرنے سے ڈرتا ہے کہ یہ میرے لیے خطرے کا باعث نہ بن جائے۔ چاہے وہ کوئی کھانے کی چیز ہو یا روز مرہ کی اشیاء۔ کہتے ہیں انگریز اصول و قواعد کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ کسی شہر میں نہر کا ایک بڑا پل تھا۔ جہاں ہر وقت ٹریفک کی ریل پیل رہتی تھی۔ ایک انگریز کو کسی کام کی غرض سے وہ پل کراس کرنا تھا لیکن وہاں پہنچ کر وہ واپس مڑ گیا کیوں کہ اس پل کی معیاد چار ماہ پہلے ختم ہو چکی تھی لیکن ہمارے پاکستانی بھائی بے دھڑک ہو کر اس پل کا استعمال کر رہے تھے۔ ہم لوگ اس چیز کا زیادہ استعمال کرتے ہیں جس کی معیاد ختم ہو چکی ہوتی ہے۔اب آتے ہیں ایک شرارت کی طرف۔

گرمی کی چھٹیوں میں تو ہر کوئی نت نئی شرارتوں اور دوسروں کو تنگ کرنے کی منصوبے بناتا ہے لیکن ہم نے اس بار سردی کی چھٹیاں بھی خالی نہ جانے دیں۔ دسمبر ٹیسٹ کی تیاری میں تھوڑا مصروف رہنے کی وجہ سے چھٹیوں کا پتا ہی نہ چلتا تھا لیکن اس بار چھٹیاں معمول سے کچھ زیادہ ہوئی تھیں، اس لئے ہمیں موقع مل گیا تھا۔

ہمیں اس گاؤں میں رہتے ہوئے سات سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ان سالوں میں ہمارا بچپن، لڑکپن میں تبدیل ہوا۔ ہم نے بھی ہر وہ شرارت کی جو بارہ سال کے بچے کا حق ہوتا ہے۔ یہ منصوبہ کچھ بڑا تھا جو پچھلے دو سال سے ہم سوچ رہے تھے۔ لیکن درست رائے اور حکمت عملی نہ ہونے کی وجہ سے ملتوی کر دیتے۔ آج باتوں باتوں میں ''مرچو'' کے مشورے نے سب کو چونکا دیا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کی یہ رائے سب کو پسند آئی۔ اس کے لئے انہوں نے لنگوٹ کس لئے۔

وہ عورتیں جو عمر رسیدہ ہو جاتی ہیں، ان کی اکثر عادتیں بڑی عجیب ہو جاتی ہیں۔ جیسے کسی ایکسپائرڈ چیز کو استعمال کرنا یا چھیڑنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے، ویسے ہی ان عورتوں سے شرارت کرنا بھی آپ کو پریشانی میں مبتلا کر سکتا ہے۔

ماسی گلاں ہمارے گاؤں کی بڑھیا جو اپنے پوتے کے ساتھ ایک گھر میں رہتی تھی۔ گاؤں کے شمال میں ایک گھنا کینوؤں کا باغ تھا جو ماسی گلاں کا کل سرمایہ تھا۔ دسمبر کے جاڑے میں اس باغ کے قریب سے گزرتے تو منہ میں پانی بھر آتا۔ اس کی کھٹی میٹھی خوشبو ہماری بھوک کو چمکا دیتی اور جو مزہ کینو کے باغ سے تازہ کینو توڑ کے کھانے کا ہے، وہ بازار کے کینو میں بالکل بھی نہیں۔ باغ میں کھڑے شاخوں پر لگے کینوؤں کی بھینی بھینی خوشبو جب ناک کے نتھنوں سے ٹکراتی ہے تو اچھے بھلے آدمی کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ ہم پچھلے دو تین سالوں میں لاکھ کوشش کے باوجود اس باغ سے ایک کینو توڑنے کی جرأت نہ کر

سکے کیوں کہ اس کی نگران ماسی گلاں خود تھی۔ کینوؤں کے موسم میں وہ گھر کم جب کہ باغ میں زیادہ پائی جاتی۔ اس کی آنکھیں کوے سے تیز، چال لومڑی جیسی اور جسم ہرن کی طرح پھرتیلا تھا۔ اس وجہ سے ہم کبھی باغ کے قریب بھی نہ جا سکتے تھے۔ جب بھی دیکھو وہ باغ کی نگرانی کر رہی ہوتی اور اگر کوئی بچہ یا بڑا اس طرف آنکلتا تو ماسی گلاں آسمان سر پر اُٹھا لیتی: ''ارے! ادھر کو کاہے جا رہا ہے، تجھے اور راستہ نہیں دکھتا۔ بڑا شوق ہے نا تجھے چوری کے کینوں کھانے کا۔ ہاتھ تو لگا کے دیکھ، تیرا ہاتھ کاٹ دوں گی۔ آج کے بعد اس راستے سے مت گزریو۔''

سردیوں کی اتنی چھٹیاں دیکھ کر ہم پھولے نہیں سمائے تھے اور ہم نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اس بار تو جی بھر کے کینوں کھانے ہیں اور اپنے دوستوں کی بھی دعوت کرنی ہے۔ اس پراجیکٹ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ''مرچو'' کی حکمت عملی سب کو پسند آئی، چنانچہ اس پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

''اماں جی! اماں جی......!'' شبو ہانپتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا میرے لال کو......؟'' ''ماں جی! وہ بڑے انکل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، وہ فوت ہو گئے ہیں۔''

یہ سننا تھا کہ ماسی گلاں نے گاڑی کے پھٹے سلنسر کی طرح چیخ پکار شروع کر دی جو اس کی ایکسپائری ڈیٹ قریب ہونے کا عملی ثبوت تھا۔ اسی چیخ پکار کو جاری رکھتے ہوئے وہ گلیوں سے گزرتی واویلا کر رہی تھی: ''ہائے میرا بیٹا مر گیا ہے، ہائے میں بھی مر جاؤں گی۔''

گلیوں سے کچھ عورتیں بھی اس کے ساتھ مل گئیں جنہوں نے ماسی گلاں کی پیروی شروع کر دی۔ اب ماسی گلاں ایک جلوس کی شکل میں آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے پیچھے لوگوں کا ہجوم تھا جیسے گاؤں کا چودھری پہلی بار غلطی سے الیکشن جیت گیا ہو۔ گاؤں کے آوارہ لڑکوں کی تو یہ سب دیکھ کر جیسے عید ہو گئی ہو۔ چلو کچھ دن مفت کے چاول تو ملیں گے، یہ سوچ کر پورے گاؤں کے نکھے اور آوارہ لڑکے بھی اس جلوس میں شامل ہو گئے۔ ماسی گلاں اور ان کی عمر کی چند ایک بوڑھی عورتیں آگے آگے تھیں جب کہ باقی سب لوگ اس جلوس کی پیروی کر رہے تھے۔ کچھ سمجھ دار عورتیں اور آدمی اپنے گھروں کی چھتوں اور دیواروں سے اس جلوس کو تیزی سے آگے بڑھتا دیکھ رہے تھے۔

ہم چار دوست ایک گٹو مالٹوں کا بھر چکے تھے۔ اب ہم جلدی سے بھاگنا چاہتے تھے۔ ہم سڑک تک گٹو کو جیسے تیسے کندھوں پر اُٹھا کر لائے۔ اتنے میں عمیر بائیک لے کر پہنچ گیا۔ میں گٹو سمیت بائیک پر عمیر کے ساتھ سوار ہو گیا اور عمیر کو تاکید کی کہ فل ریس دے تاکہ ہمیں کوئی جاتا دیکھ نہ سکے۔

ماسی گلاں اب اپنے ہدف کے قریب تھی۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھے جیسی مخصوص آواز سن کر خان صاحب بھاگ کر گھر سے نکلے۔

''کیا ہو گیا اماں! تو ٹھیک ہے ناں سب......؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے اپنا۔'' ماسی گلاں جو کسی کا نام تک نہیں لے رہی تھی:

''ہائے میرا سونے جیسا گلاب کا پھول مر گیا۔ ستیاناس ہو اس گاڑی والے کا جس نے میرے کالو کو نیچے دے دیا۔''

کالو کا نام سننا تھا کہ کالے خان نے اپنی ماں کے سر پر بندھی پٹی جو کہ آنکھوں کے اوپر آئی ہوئی تھی، وہ ہاتھ سے اوپر کی۔ ایسے جیسے پُرانا انجن چلنا بند ہو گیا ہو۔ ماسی گلاں واپس بھاگی۔ ماسی گلاں کو دیکھ کر اس کے ساتھ آیا سارا جلوس حیران ہو گیا اور ماسی گلاں کے پیچھے ہو لیا۔ ماسی گلاں پُرانے یاماہا موٹر سائیکل کی طرح ہولے ہولے بھاگ رہی تھیں۔ ان کی سانس ایسے پھولی ہوئی تھی جیسے کوئی جنگ جیت کر آ رہی ہو اور اچانک دشمن نے پھر حملہ کر دیا ہو۔ کچھ ہی دیر میں وہ گھر پہنچ گئیں۔ محلے کی کافی عورتوں نے انہیں راستے میں روکنے اور اس طرح واپس پلٹنے کی وجہ پوچھنا چاہی مگر وہ کب رُکنے والی تھیں۔ انہیں تو شبو پہ بے پناہ غصہ آ رہا تھا۔

''شبو! تیرا خانہ خراب ہو، یہ کیا جھوٹ بولا تو نے؟ کالو تو زندہ ہے۔ لگتا ہے تو نے سارے مالٹے تڑوا ڈالے ہیں۔'' اماں وہ میرے منہ سے نکل گیا تھا کہ بڑے انکل فوت ہو گئے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ماسی گلاں کا پارہ ہائی ہو گیا۔ انہوں نے چولہے میں آگ جلانے اور پھونک مارنے والی پھونکنی اُٹھا لی اور شبو کے پیچھے ہو لیں۔ باقی جو گزری شبو پر گزری کیوں کہ ہم شبو کو ایک سو روپے دے کر ماسی گلاں سے جھوٹ بلوا چکے تھے۔ ہم مالٹے توڑنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اب ہم اپنے پیارے دوست عبدالحمید ہاٹی کی بیٹھک میں مالٹوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور آج والا کارنامہ باقی سب دوستوں کو بھی سنا رہے تھے۔ سبھی ہمیں خوب داد دے رہے تھے۔

ابھی ہم مالٹوں سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ ہمارے ابو وہاں پہنچ گئے۔ میں اور عمیر انہیں اچانک وہاں دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ دراصل انہیں بھی ہمارے آج والے کارنامے کی خبر ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہمیں وہاں سے اُٹھایا اور باہر لے آئے۔ پھر جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا، وہ بتانے سے قاصر ہیں۔ چھوڑیئے زخم تازہ نہ کیجیے۔ اس کے بعد ہم نے مالٹے چوری کرنے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

رجب طیب اردوغان: نیوی کے ایک سابق کیپٹن کا بیٹا جس نے بچپن بڑی عسرت سے گزارا تھا، اس نے مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کی اور اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے بچپن میں استنبول شہر میں نانیاں بیچتا رہا۔ ترکی کے سب سے بڑے شہر استنبول کی گلیوں میں سر پر ٹوکری اٹھائے گھوم پھر کر آوازیں لگا کر سامان بیچنے والا تیرہ سالہ بچے نے ترقی کی منزلیں اپنی ذہانت کے ساتھ ساتھ امانت، دیانت اور جہد مسلسل کے ساتھ طے کیں۔ 27 مارچ 1994ء کو بلدیاتی الیکشن کے نتیجے میں استنبول کا میئر ایک ایسا شخص منتخب ہوا جسے دنیا طیب اردوغان کے نام سے جانتی ہے۔ جن لوگوں نے 1994ء سے پہلے استنبول دیکھا ہوا ہے وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ترقی کا یہ سفر کسی معجزے سے کم نہیں۔ پانی کی قلت، آلودگی کی کثرت، بے ہنگم ٹریفک، کھنڈر سڑکیں اور ساتھ ہی استنبول کی میٹروپولیٹن میونسپلٹی دو ارب ڈالر کی مقروض تھی لیکن حیرت کی بات ہے کہ چار سال سے کم عرصہ میں نہ صرف دو ارب ڈالر کے قرضے واپس کر دیئے گئے بلکہ چار ارب ڈالر سے زائد استنبول کی تعمیر و ترقی پر خرچ کیا گیا۔ پچاس سے زائد بڑے پل تعمیر کیے گئے، ٹریفک کو رواں دواں رکھنے کے لیے لاتعداد اوور ہیڈ برج اور نئی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ لوٹ مار اور کرپشن کے خاتمے کا صرف اعلان نہیں بلکہ عملی طور پر اس کا خاتمہ کیا گیا۔ ترکی کے نصیب کچھ اس طرح جاگے کہ استنبول کی ترقی کو ایک نمونہ کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ استنبول سے باہر نکلتے ہی ایسا لگتا تھا جیسے آپ یورپ کے انتہائی ترقی یافتہ ملک سے نکل کر تیسری دنیا کے کسی انتہائی پسماندہ گاؤں میں داخل ہو گئے ہیں۔ ڈیڑھ عشرہ قبل ترکی کو ناکام پالیسیوں، بدعنوانیوں، فوجی آمروں کی بدمستیوں کے باعث یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا لیکن ترکی اب طیب اردوغان کی قیادت میں دنیا کی بڑی معیشت بن چکا ہے۔ طیب اردوغان سیکولر اور مذہبی طبقے دونوں کی شدت پسندی کے خلاف ہیں۔ انہوں نے معاشرے کو حقیقتاً اعتدال پسند اور روشن خیال بنا دیا جس کے نتیجے میں ترکی میں مسجدیں بھی آباد ہیں اور کلب بھی کھلے ہیں۔ طیب اردوغان نے اسکولوں اور اسپتالوں کا نظام بھی ٹھیک کر دیا اور انہوں نے ترکش کمپنیوں کو ملک سے باہر کام کرنے کی ترغیب بھی دی۔ چنانچہ اب بے شمار ترک کمپنیاں مختلف ممالک میں کام کر رہی ہیں۔ طیب اردوغان 1994ء سے 1998ء تک استنبول کا میئر رہا اور اس نے کمال کر دیا۔ طیب اردوغان نے اس کام یابی کی بنیاد پر 2001ء میں جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ کے نام سے اپنی سیاسی جماعت بنالی۔ نجم الدین اربکان کے بے شمار ساتھی ٹوٹ کر اردوغان کی جماعت میں شامل ہو گئے اور اردوغان نے 2002ء کا الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ الیکشن ہوا اور اردوغان 34 فیصد ووٹ لے کر ملک کے وزیراعظم بن گئے۔ اردوغان نے وزیراعظم بننے کے بعد استنبول کی اصلاحات پورے ملک تک پھیلا دیں۔ 2007ء تک ان اصلاحات کا رنگ سامنے آ گیا، چنانچہ عوام نے 2007ء کے الیکشن میں انہیں 47 فیصد ووٹ دے کر دوسری بار وزیراعظم بنا دیا گیا۔ 2007ء سے 2011ء کے درمیان طیب اردوغان ملکی پیداوار کو 9 فیصد تک لے گئے۔ یہ شرح چین کے بعد دنیا کے بیس بڑے ممالک میں دوسرے نمبر پر تھی۔ طیب اردوغان کی معاشی اصلاحات کے نتیجے میں لوئر مڈل کلاس، مڈل کلاس میں آ گئی اور مڈل کلاس، اپر کلاس بننے لگی۔ لوگوں کے گھر خوش حالی آئی اور یہ سکون اور آسائش کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔ چنانچہ عوام نے طیب اردوغان اور ان کی جماعت کو تیسری بار پہلے سے زیادہ ووٹ دے کر حکمران بنا دیا گیا۔ طیب اردوغان کا ترکی، ملائیشیا اور دبئی کے بعد تیسرا ملک ہے جس نے اسلامی دنیا میں یورپ اور امریکہ کی ترقی متعارف کرائی اور اہل مغرب کو حیران کر دیا۔ لہٰذا آج ترکی میں امن بھی ہے، سکون بھی، خوشحالی بھی اور ترقی بھی۔ یہ کارنامہ اکیلے طیب اردوغان نے سرانجام دیا۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ ایک ایمان دار اور مخلص حکمران چند برسوں میں صدیوں کی خامیاں دور کر سکتا ہے۔ یہ ترکی کے 81 میں سے 66 صوبوں میں کام یاب ہو چکے ہیں اور انہوں نے 550 کے ایوان میں 337 نشستیں حاصل کی ہیں۔ اگر طیب اردوغان کی کام یابیوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو دنیا کا خیال ہے کہ طیب اردوغان اگلے الیکشن میں 75 فیصد ووٹ لے کر کام یاب ہوں گے اور اس کے بعد یہ ترکی کو فوج اور سیکولرزم دونوں سے آزاد کرا دیں گے۔ رجب طیب اردوغان غزہ اور فلسطین کے مختلف علاقوں میں بمباری پر اسرائیل کو دہشت گرد قرار دے چکے ہیں اور اسی حمایت نے انہیں عالم عرب کا ہیرو بنا دیا۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مئی 2015ء ہے۔

کھوج لگائیے

نام: ______

شہر: ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مئی 2015ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ______

مقام: ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

مئی کا موضوع "ریلوے اسٹیشن" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 مئی 2015ء ہے۔

ہونہار مصور

نام ______ عمر ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ______ شہر ______

مقاصد ______

موبائل نمبر: ______

انوکھا مزدور

گلاب خان سولنگی

اسلم روز صبح سویرے پیدل فیکٹری جاتا تھا، جو اس کے گاؤں سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ اسلم فیکٹری میں مزدوری کرتا تھا۔ اسلم کا خاندان خاصا بڑا تھا، وہ دس بہن بھائی تھے اور ایک بوڑھی ماں جو بیمار رہتی تھی۔ اسلم کے والد فوت ہو چکے تھے اور وہ بھی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے، اپنے بچوں کو مزدوری کرنے نہیں دی لیکن ان کی وفات کے بعد گھر کی پوری ذمہ داری اسلم کے کندھوں پر آ گئی۔ چوں کہ وہ سب سے بڑا بیٹا تھا اس لیے اس نے خوشی خوشی گھر کی ذمہ داری اُٹھا لی اور اس فیکٹری میں ملازمت اختیار کی جہاں اس کا باپ مزدوری کرتا تھا۔

اسلم ایم اے پاس تھا لیکن محنت مزدوری کرنے میں اسے کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی جب کہ نوکری کی تلاش میں اس نے کوئی بھی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اسلم جتنا کما لیتا تھا، اس سے گھر کا خرچہ اور چھوٹے بہن بھائیوں کی پڑھائی کا خرچہ بھی بڑی مشکلوں سے پورا ہوتا تھا لیکن پھر بھی وہ صبر وشکر سے کام لیتا تھا۔ اسلم کے گاؤں سے ایک کچا راستہ شہر کی طرف جاتا تھا، جس کے چاروں طرف ہرے بھرے کھیت اور باغات واقع تھے۔ اسلم روز اسی راستے سے میں شہر جاتا تھا اور پورا دن فیکٹری میں کام کر کے شام کو جب واپس اپنے گاؤں آتا تھا تو گاؤں کے کھیت کھلیان دیکھ کر اس کی تھکن دُور ہو جاتی تھی۔ وہ گاؤں کی چھوٹی مسجد میں نماز ادا کرتا اور رات کو جلدی سو جاتا تھا۔ اسی طرح وہ صبح سویرے اُٹھتا تھا اور نمازِ فجر سے فارغ ہو کر ناشتا کرتا اور بعد میں کام پر جاتا تھا۔

اسلم نے دیکھا کہ کافی دنوں سے ایک اجنبی بوڑھا شخص گاؤں سے دُور ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم دکھائی دیتا تھا۔ اس اجنبی کی خاص بات یہ تھی کہ قومی پرچم ہر وقت اس کے ہاتھوں میں رہتا تھا۔ اسلم صبح کو جب بھی اس کے پاس سے گزرتا، تب وہ اسے سلام کرتا لیکن وہ بوڑھا خاموش رہتا تھا۔ پہلے تو اسلم نے سمجھا کہ شاید اس بوڑھے اجنبی کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے لیکن ایک دن اس اجنبی شخص نے اسلم کے سلام کا جواب دیا اور اسلم کو اپنے پاس بلایا اور کہا:

”بیٹا! آپ کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں؟“ اسلم بھی اس بوڑھے شخص کے پاس بیٹھ گیا اور اسے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:

”بابا میرا نام اسلم ہے، میں ساتھ والے گاؤں میں رہتا ہوں۔ میں ایک غریب مزدور ہوں اور اپنے خاندان کی کفالت کے لیے شہر کی فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ میں نے ایم اے پاس کیا ہوا ہے۔“ وہ بوڑھا پھر سوچوں میں گم ہو گیا۔ اسلم پھر گویا ہوا۔ ”بابا! میں کافی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ یہاں اکیلے بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر

آپ بُرا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور ہاں! یہ قومی پرچم آپ ہر وقت کیوں اُٹھائے رکھتے ہیں؟"

اجنبی شخص نے اس مرتبہ تھوڑا مسکرا کر اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر سہی!"

اسلم نے اس سے اجازت لی اور فیکٹری کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ پورا راستہ یہی سوچتا رہا کہ وہ اجنبی بوڑھا کس بات کی وجہ سے پریشان ہے اور اپنی کہانی مجھ سے کیوں چھپا رہا ہے۔ اس طرح اسلم نے اپنا معمول بنا لیا کہ وہ صبح کام پر جاتے ہوئے کچھ دیر اس بوڑھے شخص کے پاس بیٹھتا اور گپ شپ لگاتا۔ یوں کافی دن گزر گئے۔ اب تو وہ اجنبی بوڑھا بھی اسلم سے کافی مانوس ہو گیا تھا اور جس دن اسلم سے ملاقات نہیں ہوتی تھی تو وہ شخص پریشان ہو جاتا تھا۔ ایک دن اسلم نے بوڑھے شخص سے کہا: "بابا! میں آج آپ کے لیے ایک تحفہ خرید کر لایا ہوں۔" بوڑھا بولا: "بیٹے، تم ایک غریب مزدور ہو اور مجھے کسی تحفے کی ضرورت نہیں ہے۔" جب اسلم نے نئے کپڑے سے بنا ہوا قومی پرچم اس کے سامنے پیش کیا تو وہ حیران ہو گیا اور فوراً اسلم سے وہ پرچم لیا اور اسے آنکھوں پر لگاتے ہوئے چوما اور پُرانے کپڑے کا پرچم اُتار کر نیا پرچم لگایا اور پُرانا پرچم اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔

"بیٹا! آپ میرے لیے وہ تحفہ لائے ہیں جسے چاہ کر بھی میں واپس نہیں کر سکتا، لیکن آپ نے یہ زحمت کیوں اُٹھائی، کم از کم مجھ سے پوچھ ہی لیا ہوتا۔" اسلم بولا: "بابا جی! اگر پوچھ کر لاتا تو یہ جو آپ کے چہرے پر رونق آ گئی ہے، اسے نہیں دیکھ پاتا۔" تب بوڑھے شخص نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا: "میں آپ کا مستقبل روشن دیکھ رہا ہوں، مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنی منزل بہت جلد ملنے والی ہے کیوں کہ آپ ایک سچے پاکستانی ہیں۔"

بوڑھے شخص کی بات سن کر اسلم مایوسی والی کیفیت میں بولا: "بابا، جس ملک میں میرے جیسے پڑھے لکھے انسان، فیکٹریوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہوں، بھلا ان کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے؟"

اسلم کو مایوس دیکھ کر وہ شخص بولا: "بیٹے! مایوسی کفر ہے، آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسا کرو اور نا اُمید نہیں ہونا۔"

"بابا! وہ سب تو ٹھیک ہے مگر میری یہ ڈگریاں کس کام کی؟ آپ کو پتا ہے کہ ان ڈگریوں کے پیچھے میرے مرحوم والد صاحب کا خون پسینہ شامل ہے۔ کتنی محنت، مشقت کے بعد انہوں نے ہمیں پڑھایا تھا۔"

"کیا بات ہے بیٹا! پہلے تو آپ اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے تھے لیکن آج کیا بات ہے جو اتنے پریشان ہیں؟" اسلم بولا: "بابا جی! بات دراصل یہ ہے کہ کل میں نے فیکٹری کے مینیجر سے اپنی تنخواہ میں سے کچھ رقم ایڈوانس مانگی تھی تاکہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے امتحان کی فیس ادا کر سکوں لیکن اس نے انکار کر دیا۔ مینیجر سمیت فیکٹری مالکان کی بے حسی دیکھیے کہ ابھی تک مزدوروں کے لواحقین کو ان کے حقوق نہیں ملے۔ بابا یہ مزدور بھی تو انسان ہوتے ہیں، پھر یہ حکومتی ادارے مزدور طبقے کے حقوق کیوں نہیں ادا کرتے؟ صرف کھوکھلے نعروں سے تو کام نہیں چلتا......"

بوڑھا بولا: "بیٹا! فیکٹری کے مالک کا کیا نام ہے؟" اسلم نے جواب دیا: "سیٹھ آصف خان۔"

بوڑھے نے جب نام سنا تو ایک دم چونک گیا۔ "کیا کہا، سیٹھ آصف خان؟"

اسلم نے کہا: "ہاں بابا! ہم لوگوں نے بھی صرف اس کا نام سنا ہے، لیکن آج تک کسی نے اس کو دیکھا نہیں ہے۔ سنا ہے کہ وہ فیکٹری بنا کر اپنی فیملی سمیت لندن چلے گئے تھے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے، باقی فیکٹری کا حساب کتاب اور دیکھ بھال اس کا مینیجر کرتا ہے۔"

یہ ساری باتیں سن کر وہ اجنبی شخص رونے لگا اور روتے روتے شہر کی طرف چلا گیا۔ اسلم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بیٹھے بٹھائے بابا جی کو کیا ہوا جو اس طرح رو رہا تھا۔ خیر وہ اُٹھا اور فیکٹری کی طرف چل دیا۔

دوسرے دن اسلم کو وہ بوڑھا شخص دکھائی نہیں دیا۔ اسلم نے اسے یہاں وہاں بہت ڈھونڈا لیکن وہ کہیں بھی نہیں ملا۔ اسلم کو اس کے بارے میں فکر لاحق ہو گئی۔ "نہ جانے بے چارہ کہاں کھو گیا۔" سوچتے سوچتے وہ فیکٹری پہنچ گیا۔ جب وہ فیکٹری پہنچا تو سارے لوگ اسے عجیب و غریب نظروں سے گھور رہے تھے۔ اسلم نے کہا: "بھائی کیا ہوا! میں وہی اسلم ہوں، آپ لوگ اتنے غور سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" چپڑاسی بولا۔

"اسلم میاں! آج اس فیکٹری کا مالک آیا ہوا ہے اور وہ مینیجر کے آفس میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اس لیے یہ سارے لوگ حیران و پریشان ہیں کہ اس نے آپ کو ہی کیوں یاد کیا ہے؟"

چپڑاسی کی بات سن کر اسلم بڑا پریشان ہوا۔ "خدا خیر کرے،

لگتا ہے مینیجر صاحب نے میری شکایت لگائی ہے۔ اب تیار ہو جا اسلم بے روزگار ہونے کے لیے۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اندر داخل ہوا اور اندر جا کر اس نے وہ نظارہ دیکھا جس سے اس کی پوری زندگی ہی بدل گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اجنبی بوڑھا شخص مینیجر کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور مینیجر باادب ہاتھ باندھے اس کے پہلو میں کھڑا ہے۔

''بابا جی! آپ......؟'' اسلم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''آؤ اسلم بیٹے! اندر آؤ اور یہاں بیٹھو۔'' وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور اسلم کا بازو پکڑ کر اسے بٹھایا۔ ''لیکن یہ سیٹ تو مینیجر صاحب کی ہے؟'' ''تھی!'' اسلم نے مارے حیرت کے پھر اس بوڑھے شخص سے کہا: ''بابا جی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا اور آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' اسلم کی حیرانی تب ختم ہوئی جب وہ بوڑھا اجنبی بولا: ''سیٹھ آصف خان میرا ہی نام ہے۔''

اسلم فوراً اپنی سیٹ سے اُٹھا۔ ''بابا جی، اوہ...... معاف کرنا سیٹھ آصف صاحب! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' سیٹھ آصف نے مسکرا کر کہا: ''آپ نے بھی تو نیا قومی پرچم کا تحفہ مجھ سے پوچھے بغیر ہی دیا تھا۔ میں بھی تو آپ کے چہرے پر رونق اور حیرت دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے اپنی پہچان چھپائی اور آپ سے مجھے فیکٹری کے متعلق وہ حقائق معلوم ہوئے جن کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا لیکن شکر ہے کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں، اس لیے میں وقت ضائع کیے بغیر یہاں چلا آیا تا کہ میرے مزدور مزید بدحالی اور پریشانی سے بچ سکیں۔ سو میں نے اس مینیجر کو نوکری سے نکال دیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ اس کی جگہ آپ مینیجر ہوں گے۔ پھر تھوڑی دیر بعد پولیس بھی آ گئی اور پرانے مینیجر کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ''لیکن سر آپ لندن شفٹ ہو گئے تھے اور ہمارے گاؤں کے درخت کے نیچے آپ اکثر بیٹھا کرتے تھے اور وہ قومی پرچم ہر وقت اپنے پاس کیوں رکھتے تھے۔'' جب اسلم نے ایک ہی سانس میں بہت سارے سوالات کی بوچھاڑ کر دی، تب سیٹھ آصف نے مسکرا کر جواب دیا: ''بیٹے آپ مجھے سر نہیں بلکہ بابا جی کہہ کر پکارا کریں اور آپ اطمینان سے بیٹھیں اور میری کہانی سنیں۔ برسوں پہلے میں نے یہ فیکٹری بڑی محنت سے بنائی تھی۔ آپ کی طرح میں بھی اس ملک کے مستقبل سے مایوس تھا۔ لہٰذا میں اپنی فیملی کے ہمراہ ہمیشہ کے لیے لندن چلا گیا اور وہیں پر سرمایہ کاری شروع کر دی۔ پیچھے اس فیکٹری کی ذمہ داری مینیجر کے حوالے کر دی۔''

''لیکن فیکٹری کے معاملات میں آپ بے خبر کیسے رہ سکتے تھے؟''

سیٹھ آصف بولا: ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، دراصل لندن جا کر اپنے کاروبار کے انتظامی معاملات میں نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو سونپ دیئے تھے اور وہ مجھے سب ٹھیک ہے کی رپورٹ پیش کیا کرتے تھے۔''

''تو پھر آپ واپس کیوں آئے؟''

سیٹھ آصف نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا ''بیٹا! ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ میں جب یہاں سے دلبرداشتہ ہو کر لندن گیا تھا تو فیصلہ کیا تھا کہ پھر کبھی لوٹ کر پاکستان نہیں جاؤں گا، لیکن برسوں ایک اجنبی دیس میں رہ کر بھی حقیقی خوشی اور سکون حاصل نہیں کر سکا۔ جانتے ہو کیوں؟ کیوں کہ وہ دیس اسلامی اقدار سے خالی

ہے۔ وہاں مادی چیزوں سے فائدہ تو حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن اصلی روحانی خوشی کوسوں دُور ہے اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرے اکلوتے بیٹے نے میری خواہش کے برعکس ایک انگریز عورت سے شادی کر لی، میری بیوی تو اللہ کو پیاری ہو چکی تھی، اگر وہ زندہ ہوتی تو شاید میرا بیٹا اس کا کہا مانتا۔ اس طرح میری اولاد نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے میرے لیے واپسی کا راستہ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ تبھی میں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کے باقی دن میں اپنے ملک میں گزاروں گا۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ اگر گھر میں گندگی ہو جائے تو اس میں گھر کا نہیں بلکہ اس گھر میں رہنے والے افراد کا قصور ہوتا ہے۔ اس لیے گھر کو بُرا نہیں کہنا چاہیے لیکن یہ بات سمجھنے میں مجھے کافی وقت لگ گیا۔ مجھے شروع سے ہی گاؤں کی زندگی پسند تھی، اس لیے جب میں پاکستان واپس آیا تو صبح کی نماز سے فارغ ہو کر روزانہ میں آپ کے گاؤں واکنگ کرنے آیا کرتا تھا اور اس درخت کے نیچے اکثر بیٹھا کرتا تھا جہاں پر تم سے ملاقات ہو گئی۔ میں آپ کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ باقی رہا قومی پرچم، تو وہ میں ہر وقت اس لیے اُٹھائے رکھتا تھا کہ زندگی کا بڑا حصہ اس پرچم کے سائے تلے گزارنے سے محروم رہا ہوں اور اس سبز ہلالی پرچم کی قدر پردیس میں بسنے والے لوگوں سے کوئی پوچھے۔ اس دن جب آپ نے مجھے قومی پرچم کا تحفہ دیا تو آپ کا حب الوطنی والا جذبہ دیکھ کر مجھے میرے سارے سوالوں کے جواب مل گئے تھے اور نئے پیڑ ہی میں سے جب تک آپ جیسے باہمت اور محنت کش لوگ موجود ہیں، اس ملک کا مستقبل روشن ہے۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے، اس ملک کا مستقبل اب مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ اس لیے میں نے آپ کو اپنی فیکٹری میں مینیجر رکھا ہے تاکہ آپ اپنے مزدور بھائیوں کا خیال رکھ سکیں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کسی بھی مزدور کی حق تلفی نہیں ہو گی اور ہر مزدور کو اس کا پورا حق ملے گا۔ شاید اسی بہانے اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو جائے اور مجھے اپنے گناہوں کی معافی مل جائے۔“

”آمین!“ یہ کہتے ہوئے اسلم نے سیٹھ آصف کو گلے لگا لیا اور اس کے آنسو بھی پونچھے۔

دوسرے دن فیکٹری کے تمام مزدور بہت خوش تھے اور پوری فیکٹری مالک اور مینیجر زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔

☆☆☆

معلومات عامہ

☆ حضرت ادریس علیہ السلام کا اصل نام اخنوخ ہے۔
☆ حضرت ادریس علیہ السلام پر تیس صحیفے نازل ہوئے۔
☆ حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔
☆ سب سے پہلے قلم سے حضرت ادریس علیہ السلام نے لکھا۔
☆ سب سے پہلے نجوم کو جاننے والے حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔
☆ سب سے پہلے جہاد حضرت ادریس علیہ السلام نے کیا۔
☆ سب سے پہلے ناپ تول کا طریقہ حضرت ادریس علیہ السلام نے ایجاد کیا۔

(محمد عمیر سلیم کامیانہ، ساہی وال)

☆ جاپان میں طالب علموں کے لیے بجلی مفت ہے۔
☆ اٹلی میں سب سے زیادہ بجلی پیدا ہوتی ہے۔
☆ انڈیا میں کوئلے سے 70 فیصد بجلی پیدا ہوتی ہے۔
☆ ترکی اپنے علاوہ تین ممالک کو بجلی دیتا ہے۔
☆ چین میں تمام گھروں کے لیے بجلی مفت ہے۔
☆ انگلینڈ میں لوگ اپنی ضروریات کی بجلی بنا سکتے ہیں۔

(صباحت جمشید، لاہور)

☆ دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک (بلحاظ آبادی) انڈونیشیا ہے۔
☆ سب سے بڑا اسلامی ملک (بلحاظ رقبہ) قازقستان ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا جزیرہ گرین لینڈ ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا جنازہ اسلامی دنیا کا مصر کے صدر جمال عبدالناصر کا تھا۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا کرکٹ اسٹیڈیم آسٹریلیا میں ہے۔
☆ دنیا کا سب سے بڑا سمندر بحرالکاہل ہے۔
☆ دنیا کا سب سے بڑا قبرستان مکلی (ٹھٹھہ) پاکستان میں ہے۔
☆ دنیا کا سب سے عجائب گھر نیویارک میں ہے۔
☆ دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام پاکستان میں ہے۔ (لمبائی چالیس ہزار میل
☆ دنیا میں سب سے بڑا تیل کا علاقہ (غوار) سعودی عرب میں ہے۔

(کنزیٰ جدون، ایبٹ آباد)

☆ پاکستان کا قومی نام ”اسلامی جمہوریہ پاکستان“ ہے۔
☆ پاکستان کا قومی جھنڈا ”ہلالی پرچم“ امتیازی شان کا حامل ہے۔
☆ پاکستان کا قومی لباس ”قمیص، شلوار، شیروانی اور جناح کیپ ہے۔
☆ پاکستان کے قومی شاعر علامہ محمد اقبال ہے۔
☆ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔
☆ پاکستان کی قومی زبان ”اردو“ ہے۔
☆ پاکستان کا قومی نعرہ ”پاکستان زندہ باد“ ہے۔
☆ پاکستان کا قومی کھیل ”ہاکی“ ہے۔
☆ پاکستان کا قومی پھول چنبیلی ہے۔
☆ پاکستان کا قومی پرندہ ”چکور“ ہے۔ (کنزہ رانی، بھمبر آزاد کشمیر)

آپ بھی لکھیے

جھوٹ کا انجام

عزہ مریم، اٹک

بلال اور اس کے تینوں دوست شیشم کے گھنے درخت کے نیچے بیٹھے سوچ رہے تھے کہ آج یکم اپریل یعنی اپریل فول ہے تو اسکول میں سب کو کیسے بے وقوف بنانا ہے۔ بلال نے کہا کہ میں تو ٹیچرز کو بے وقوف بناؤں گا اور اسی طرح سب نے دوسروں کو بے وقوف بنانے کا منصوبہ بنا لیا۔ بلال اور اس کے دوستوں نے سارا دن اسکول کے بچوں کو تنگ کیا۔ کبھی کسی بچے کو کہتے کہ تمہارے سر پر چھپکلی بیٹھی ہے تو کبھی کچھ کہتے۔ سارا دن دوسروں کو بے وقوف بنانے میں گزار دیا۔ اسکول سے چھٹی کی گھنٹی بجی اور چاروں دوست اپنے اپنے گھروں کی جانب چل دیئے۔ جب بلال اپنے گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ گھر اندر سے بند ہے۔ اس نے جب دیوار سے جھانک کر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ گھر میں چور گھس آئے ہیں۔ وہ بھاگ کر گلی سے نکلا اور اپنے ایک پڑوسی سے کہا کہ میرے گھر میں چور گھس آئے ہیں۔ پڑوسی نے جواب دیا: ”بیٹا! مجھے پتا ہے کہ آج اپریل فول ہے اور تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ جاؤ! کسی اور کو بے وقوف بناؤ، میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔“ بلال نے کہا کہ وہ سچ بول رہا ہے مگر کسی نے اس کی بات نہ مانی اور انہوں نے یہی سمجھا کہ بلال انہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔

بلال بھاگا بھاگا اپنے دوست احمد کے گھر گیا اور اسے تمام صورت حال بتا دی۔ احمد اور اس کے ابو بلال کے ساتھ اس کے گھر آئے مگر اس وقت تک چور تمام سامان لے کر فرار ہو چکے تھے۔ یوں بلال کا دوسروں کو جھوٹ بول کر تنگ کرنا، اسے لے ڈوبا۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

استاد کا احترام

زینب مظہر اقبال، ہری پور

فوزیہ کا شمار کلاس کی ان لڑکیوں میں تھا جو نالائق ہونے کے ساتھ ساتھ نہ تو مس کا احترام کرتی تھی اور نہ ہی کبھی اس نے سچ بولا تھا، وہ ہمیشہ جھوٹ بولتی تھی۔ ہم تین لڑکیاں جماعت ہشتم میں پڑھتی تھیں۔ ساری کلاس ایک دوسرے کی دوست تھی۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہونے والی بچیاں ایک دوسرے کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھیں۔ ہم تینوں دوست ایک بینچ پر بیٹھتی تھیں یعنی ثمینہ، ہانیہ اور میں۔ مس صوبیہ ہم تینوں سے بہت پیار کرتی تھیں۔ جب ہم لوگوں کو سبق وغیرہ یاد نہ ہوتا تو سب کو ایک جیسی ڈانٹ پڑتی تھی۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی اسکول میں ہمارا دن بہت اچھا شروع ہوا۔ مس صوبیہ کا پیریڈ تھا۔ پوری کلاس کو سبق یاد تھا لیکن فوزیہ کو ہمیشہ کی طرح آج بھی سبق یاد نہیں تھا۔ جیسے ہی مس صوبیہ کلاس میں آئیں تو پوری کلاس احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی اور مس کو سلام کیا۔ مس نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور سبق سننا شروع کیا۔ جیسے ہی فوزیہ کی باری آئی تو اس نے بہانہ پہلے سے ہی سوچ لیا تھا۔ اس نے مس کو بتایا کہ کل جب میں اسکول سے واپس گئی تو امی مجھے اپنے ساتھ کزن کی شادی پہ لے گئیں۔ اس طرح میرے پاس وقت نہیں تھا کہ میں سبق یاد کرتی۔ دوستو! روزانہ کی طرح آج بھی فوزیہ کا بہانہ بے کار گیا۔ مس نے اسے بہت ڈانٹا۔ فوزیہ نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے کسی کزن کی شادی نہیں تھی، اس نے جھوٹ بولا تھا اور جھوٹ کا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اس کا اسی طرح روزانہ کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا تھا۔ دوسرے دن وہ اپنی ماں کو اسکول لے آئی جس نے فوزیہ کو ڈانٹنے پر اعتراض کیا۔ مس نے اس سے کہا کہ ہم آپ کے بچوں کی اچھائی کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ مس کی وضاحت پر بھی فوزیہ کی ماں چپ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

ایک چوری اوپر سے سینہ زوری۔ ماں کے لاڈ پیار نے ہی فوزیہ کو بگاڑ دیا تھا یا وہ اپنی بیٹی کو وقت گزاری کے لیے اسکول میں بھیجتی تھی۔ اس کی ماں نے ٹیچر کی بات کو سمجھنے کی بجائے ٹیچر سے بدتمیزی کی لیکن مس نہ بولیں۔ کوئی انصاف کرے نہ کرے خدا تو دیکھ رہا ہے اور وہ انصاف کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں

کو پسند کرتا ہے۔ مس صوبیہ کو فوزیہ کی ماں کے رویے کا بہت دکھ ہوا۔ جب ماں بیٹی اپنے گھر واپس گئیں تو ماں کھانا بنانے لگی۔ فوزیہ بھی اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی ماں ہنڈیا میں چمچ ہلا رہی تھی کہ ہنڈیا اُلٹ گئی جس کے نتیجے میں دونوں ماں بیٹی جل گئیں۔ فوزیہ ٹھیک ہوئی تو اس نے مس سے معافی مانگی لیکن وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مس کی نظروں میں گر گئی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ ”جس نے مجھے ایک لفظ پڑھایا اس نے مجھے اپنا غلام پالیا۔“ دوستو! ہمیں بھی اساتذہ کا کہنا ماننا چاہیے اور سبق یاد کرنا چاہیے تاکہ اساتذہ کو ہم سے کوئی شکایت نہ ہو اور ہم سب کی نظروں میں اچھے بنیں۔

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

سچی توبہ

فاطمہ ہاشم، لاہور

نور اللہ کی امی نے اس سے کہا کہ جاؤ بیٹا کب تک گھر میں پڑے رہو گے۔ کوئی کام کرو تاکہ گھر کے حالات کچھ بہتر ہوں۔ نور اللہ نے اپنے ایک ملنے والے سے نوکری کی بات کی۔ اس کا نام عبدالرحمٰن تھا، وہ کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس نے نور اللہ سے پوچھا کہ تمہاری تعلیم کتنی ہے؟ اس نے بتایا کہ بی۔اے کیا ہے۔ وہ حیران ہو گیا اور کہا کہ وہ جلد ہی نوکری کے لیے کچھ کرے گا۔ ایک دو دن گزر گئے، ماں نے کہا کہ جا کر عبدالرحمٰن سے پوچھو کہ اس نے نوکری کا کچھ کیا ہے۔ عبدالرحمٰن نے ٹال مٹول شروع کر دی۔ اس نے آ کر اپنی ماں کو بتایا کہ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہمارا کام کرے گا۔ ماں نے جواب دیا کہ بیٹا، کسی اور سے بات کر کے دیکھو۔ وہ گھر سے نکلا تو اسے اسکول کے ماسٹر صاحب ملے۔ نور اللہ نے ان سے بات کی۔ انہوں نے کہا کہ تم میرے ساتھ آؤ۔ نور اللہ نے ماسٹر صاحب کو ساری بات بتائی۔ جس ہوٹل میں بیٹھے وہ بات کر رہے تھے، وہاں عبدالرحمٰن سب باتیں سن رہا تھا۔ نور اللہ نے کہا، پہلے بھی بہت لوگوں نے میرا وقت ضائع کیا ہے۔ ماسٹر صاحب نے کہا جو لوگ کوئی بات کہہ کر اسے نہ کر پائیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ ”اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو۔“ اس لیے تم کل اسکول میں آ جانا کلرک کی جگہ خالی ہے۔ نور اللہ بہت خوش ہوا اور وہ دونوں وہاں سے چل دیئے۔ عبدالرحمٰن نے جب ساری باتیں سنی تو وہ بہت نادم ہوا۔ اس نے سچی توبہ کر لی۔ نور اللہ کو نوکری مل گئی۔ اس کی ماں بہت خوش ہوئی۔ ان کے گھر میں خوش حالی آ گئی۔

پیارے دوستو! ہم سب کو بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہم جو کام نہ کر سکتے ہوں اسے کرنے کی ہامی نہ بھریں اور نہ ہی کسی کو دھوکا دیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اللہ ناراض ہوگا اور کسی مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اللہ کو ناراض کرے۔

تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب

حسد کی آگ

مناہل نسیم، اسلام آباد

عمر اپنی جماعت کا نہایت ہی ذہین اور ہونہار طالب علم تھا۔ وہ گھر والوں کی بھی آنکھ کا تارا تھا۔ وہ نہایت ہی فرماں بردار بچہ تھا۔ اس کا گھرانہ چار لوگوں پر مشتمل تھا۔ عمر، عمر کے ماں باپ اور عمر کی پیاری چھوٹی بہن سارہ۔ عمر اور سارہ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ آج عمر کا آٹھویں جماعت میں پہلا دن تھا۔ ساتویں جماعت میں عمر نے اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ آج جماعت میں بہت سے نئے لڑکوں کا داخلہ ہوا۔ ان میں سے ایک لڑکا عثمان بھی تھا۔ عثمان آتے ہی سب میں گھل مل گیا۔ دن گزرتے گئے اور اب تو عثمان اساتذہ کی نظر میں ایک منفرد مقام حاصل کر چکا تھا کیوں کہ وہ ایک لائق طالب علم تھا۔ پوری جماعت اس کی دوست بن چکی تھی۔ یہ دیکھ کر عمر کے دل میں حسد کی آگ بھڑکی۔ اس نے عثمان سے بات چیت ختم کر دی۔ اس نے اپنے دوستوں سے بھی کہہ دیا کہ جو بھی عثمان سے بات کرے گا، وہ مجھ سے بات نہ کرے۔ اب وہ گھر میں بھی چپ رہنے لگا۔ وہ عمر جس کے چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ رہتی تھی، اب اُداس رہنے لگا اور سب سے بڑھ کر اس نے نماز سے دُوری اختیار کر لی تھی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس مسجد میں عثمان نماز پڑھنے جاتا تھا اور دوسری مسجد خاصی دُور تھی۔ پہلے پہل تو وہ گھر میں نماز پڑھ لیتا تھا مگر اب تو یہ بات بھی نہ رہی۔ اس کا اثر اس کی پڑھائی پر بھی ہوا۔ وہ ہمیشہ ٹیسٹ میں پورے نمبر لیتا تھا، آج...... صفر یا ایک دو نمبروں سے اوپر جا ہی نہیں رہا۔ اساتذہ بھی حیران تھے کہ عمر کو کیا ہو گیا ہے؟ عمر کے گھر والے بھی خاصے پریشان تھے۔ والدین نے عمر کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ ہر بار ٹال مٹول کر دیتا مگر ان سب سے زیادہ پریشان اس کی لاڈلی بہن

سارہ تھی۔ وہ رو رو کر اللہ سے دعائیں مانگتی تھی کہ یا اللہ! مجھے میرا پرانا بھائی لوٹا دے۔ عمر کے اسکول کا اصول تھا کہ جو طالب علم پہلی سہ ماہی امتحانات میں اوّل پوزیشن حاصل کرتا تھا، وہی کلاس کا مانیٹر ہوتا تھا۔ پچھلے سات سالوں سے عمر کلاس کا مانیٹر تھا۔ عمر نے اسی طرح سارے پرچے دیئے اور جب رزلٹ آیا تو خلاف توقع عمر کی آٹھویں پوزیشن تھی اور عثمان نے جماعت میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ عمر کے لیے یہ بڑا دھچکا تھا۔ اسے یہ لگا کہ جیسے اسے پہاڑ کی چوٹی سے کسی نے نیچے دھکا دے دیا ہو۔ عمر سے یہ سب برداشت نہ ہوا اور اب تو وہ عثمان کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ عمر کے تمام دوست بھی عمر سے دُور اور عثمان کے قریب ہوتے چلے گئے مگر اس کی وجہ عثمان کا اچھا اخلاق تھا۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی عمر اندر ہی اندر بیمار رہنے لگا، اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے۔

ایک رات وہ بیٹھا ہوا تھا تو اس کی نظر کیلنڈر پر پڑی۔ اگست کا مہینہ شروع ہو چکا تھا مگر اس پر ابھی بھی جون جگمگا رہا تھا۔ عمر اُٹھا اور اُٹھ کر کیلنڈر کے صفحے بدلنے لگا۔ اگست والے صفحے پر ایک حدیث لکھی ہوئی تھی:

''حسد انسان کی نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے دیمک لکڑی کو کھا جاتی ہے۔''

عمر اس حدیث کو بہت غور سے پڑھنے لگا اور اس پر سوچنے لگا۔ اس کو لگا کہ یہ حدیث اسی کے لیے ہے۔ اس کو بہت شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا تو سامنے ہی اس کی بہن بیٹھی تھی۔ عمر نے شرارت سے اس کی چٹیا کھینچی۔ آج عمر کا اندر سے سویا ہوا انسان جاگ چکا تھا۔ سارہ بھی بہت خوش ہو گئی۔ اسے لگا کہ جیسے اسے اپنا کھویا ہوا بھائی واپس مل گیا ہو۔ عمر نے اپنی سائیکل اُٹھائی اور گھر سے نکل گیا۔ اس کے قدم عثمان کے گھر کی جانب اُٹھ رہے تھے کیوں کہ اسے ایک اہم کام سرانجام دینا تھا...... عثمان سے معافی مانگنے کا کام اور اس سے دوستی کرنے کا!

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

کاری ضرب

ازکی اخلاق بٹ، شیخوپورہ

''عادل...! عادل بیٹا! جلدی سے اُٹھ کر اپنی کتابیں کھول لو۔ میری جان، آپ کے پڑھنے کا وقت ہو رہا ہے۔'' عالیہ بیگم نے زور و شور سے ہنڈیا میں چمچ چلاتے ہوئے کچن سے ہی ہانک لگائی تو کمرے میں بیٹھے کمپیوٹر پہ گیم کھیلتے عادل کا دل جل کر کباب ہو گیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی یوں ناگواری سے پہلو بدلا جیسے کسی نے اس کی دُکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔ چند لمحوں تک وہ ماں کی دوسری بار آواز کا انتظار کرنے لگا مگر ان کے دوبارہ آواز نہ دینے پر وہ کندھے اُچکا کر پھر سے گیم کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ ایسے ہی کتنا وقت گزر گیا، اسے پتا ہی نہ چلا۔ کافی دیر بعد اس نے دروازہ کھلنے کی آواز پر مڑ کر دیکھا تو عالیہ بیگم گیلے ہاتھ رومال سے پونچھتے ہوئے دروازے میں کھڑی تھیں۔ نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔

''بیٹا! میں نے آپ سے کتابیں کھولنے کو کہا تھا اور آپ تب سے یہاں کمپیوٹر کھولے بیٹھے ہیں۔ وجہ......؟ کیا میری آواز آپ کو سنائی نہیں دی تھی؟'' الفاظ کے برعکس ان کا لہجہ کچھ نرم تھا۔ جب ہی اس نے کچھ کہنے کا حوصلہ کیا۔

''دراصل ممی، میرے سر میں بہت درد ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اپنا دھیان پڑھائی پر مرکوز رکھ سکوں گا اور......'' چہرے پر مسکینیت طاری کیے ابھی وہ بول ہی رہا تھا کہ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''پڑھائی کی طرف آپ کا دھیان پہلے بھی کون سا ہوتا ہے۔ تین گھنٹے تک لگاتار کمپیوٹر سکرین پر نظریں جما کر گیم کھیلی جا سکتی ہے لیکن اپنی کتابوں کو ایک گھنٹہ نہیں دیا جا سکتا۔ اُٹھیے اور کتابیں کھولیں اپنی۔'' ان کے لہجے کی سختی سے گھبرا کر اسے چار و نا چار اُٹھنا ہی پڑا۔ پھر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق کتاب کھولی اور الفاظ کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

عادل زمان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ حال ہی میں دسویں جماعت میں گیا تھا مگر پڑھائی سے اس کی دلچسپی اب بھی صفر تھی۔ نویں جماعت بھی اس نے دو مرتبہ کی کوشش سے پاس کی تھی۔ بے چارے والدین تو اپنی پوری کوشش کر رہے تھے کہ ان کا اکلوتا سپوت پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جائے مگر پڑھائی سے تو گویا اس کی جان جاتی تھی۔ فزکس اور کیمسٹری کی کتابوں کو کھولتا تو اسے ناکوں چنے چبوانے کا محاورہ یاد آ جاتا تھا۔ میتھ اس کے سر سے یوں گزر جاتا تھا کہ گزرنے کے بعد اس کی باقیات یعنی

کوئی ایک لفظ بھی اس کے پلے نہ پڑا ہوتا اور انگلش......؟ اس کا تو نام سنتے ہی اس کی مٹھیاں بھینچ جاتی تھیں۔ بغیر کہے وہ کبھی خود سے پڑھنے نہیں بیٹھتا تھا۔ اس دن بھی اپنی والدہ کے کہنے پر وہ پڑھنے تو بیٹھ گیا مگر پڑھائی کے بارے میں ان کی سختی کی وجہ سے اگلے دن اسکول جانے کے بعد بھی اس کا موڈ جلدی ٹھیک نہ ہو سکا تھا۔

''کیا بات ہے عادل! منہ پہ بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں۔ پریشان ہو؟'' اسکول میں اس کے نئے بننے والے دوست ذیشان نے مصنوعی اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا تو وہ بھی پھٹ پڑا۔ پڑھائی سے اپنی شدید ناپسندیدگی کے باوجود اپنے والدین کے تعلیم پر زور دینے کا رونا رونے لگا۔

''میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا ذیشان! کہ آخر ڈیڈی کی دولت میرے کس کام کی؟ اگر اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مجھے پڑھنا پڑھے۔ ان کی ساری دولت و جائیداد میری ہی تو ہے لیکن انہیں یہ بات کون سمجھائے۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''ہاں! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آخر تمہارے ڈیڈی کا سارا کاروبار تمہارا ہی تو ہے اس کے باوجود تمہارے والدین کا یہ رویہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اس سے ہمدردی جتانے لگا۔ درحقیقت اس کی عادل سے دوستی کی وجہ عادل کی بھری ہوئی جیب ہی تو تھی۔

اسکول سے گھر واپسی پر کھانا اسے اس کی ممی ہی دیا کرتی تھیں۔ آج خلافِ معمول انہیں کچن میں موجود نہ پا کر وہ کچھ حیران سا ہوا۔ یونی فارم تبدیل کر کے وہ ان کے کمرے میں گیا تو بے اختیار ٹھٹک کر رُک گیا۔ عالیہ بستر پر بیٹھی روانی سے آنسو بہا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ان کے رونے میں شدت آ گئی۔ وہ ماں کے آنسوؤں کے سامنے پگھل گیا تھا۔

''کک...... کیا ہوا ممی؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟ رو کیوں رہی ہیں آپ؟'' وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ان کے قریب بیٹھ کر ایک ہی سانس میں پریشانی سے استفسار کرنے لگا۔

''عادل، تمہاری خالہ کا فون آیا تھا بیٹا! وہ بہت رو رہی تھیں، بہت پریشان تھیں۔ تمہارے خالو کی وفات کے صرف چار ماہ بعد ان کے جیٹھ اور ان کے بیٹوں نے اصغر بھائی کے سارے کاروبار پر قبضہ کر لیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ گھر بھی نہیں دیا۔ اتنے عیش و آرام میں رہنے والی میری بہن اور بھانجے کرائے کے معمولی سے مکان میں رہ رہے ہیں۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا لیکن نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ انہیں دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے ہیں۔ ان کی آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ دونوں بیٹے جوان ہونے کے باوجود روزی کمانے کے قابل نہیں ہیں کیوں کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ وہ باپ کے اسی کاروبار کے سہارے آس لگائے بیٹھے تھے جو اب نہیں رہا۔ وہ معمولی نوکری جو ایک میٹرک پاس شخص کو بھی مل سکتی ہے، اس کے بھی اہل نہیں ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ کاش! ہم نے تعلیم کی قدر کو پہچانا ہوتا تو آج اس حال کو نہ پہنچتے۔ اب تو تم جان گئے ہو گے ناں کہ میں تمہاری تعلیم پر اتنا اصرار کیوں کرتی ہوں، صرف اس لیے تاکہ تم پر وہ دن نہ آئے کہ تم حسرت سے یہی بات کہنے پر مجبور ہو جاؤ۔'' عادل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی ماں کے اس رویے کے پیچھے اتنی بڑی وجہ ہو سکتی تھی۔ اس کا دل موم کی طرح پگھل گیا تھا۔ اپنے خالہ زاد بھائیوں کے انجام نے اس کے دل پر کاری ضرب لگائی تھی۔ وہ اپنی ماں کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھوں کو تھام کر اس نے بڑے عزم سے کہا:

''مجھے معاف کر دیں ممی! میں جان گیا ہوں کہ میں بہت غلط تھا۔ تعلیم واقعی زندگی کے ہر میدان کی ضرورت ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں دل لگا کر پڑھوں گا۔ اس کی والدہ نے جھک کر اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

رجب کی آمد اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعا

جب رجب کا مہینہ شروع ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوں دعا فرماتے تھے:

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ

''اے اللہ! ہمارے لیے برکت عطا فرما ماہ رجب وشعبان میں اور ہمیں (خیریت کے ساتھ) ماہ رمضان تک پہنچا دے۔''

(الدعوات الکبیر للبیہقی، حدیث: 529)

پاکستان کے مشہور سراغ رساں شہاب زیدی کے دونوں بیٹے، عامر اور عمار، ان دنوں اپنے چچا کے پاس نیروبی آئے ہوئے تھے۔ نیروبی افریقہ کے ایک ملک کینیا کا دارالحکومت ہے۔ زیدی صاحب کے چھوٹے بھائی کینیا کے بڑے اسپتال میں سرجن تھے اور وہ ان کی بیماری کی خبر سن کر اپنے کنبے کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ وہ خود تو چند دن یہاں رہ کر پاکستان واپس چلے گئے مگر ان کی بیوی، بہن اور دونوں لڑکے یہیں رہ گئے، کیوں کہ عامر اور عمار کو یہ جگہ بہت دل چسپ معلوم ہوئی تھی اور وہ سیر و تفریح کی غرض سے کچھ عرصہ اور یہاں رہنا چاہتے تھے۔

دونوں بھائی صبح سویرے چچا کی خوب صورت سیاہ کرونا گاڑی لے کر نکل جاتے اور دُور دُور تک چکر لگاتے۔

ایک دن وہ لمبی ڈرائیو کے بعد گھر واپس آ رہے تھے کہ ایک نیلی ٹیوٹا وین زن سے ان کے قریب سے گزری اور پوری رفتار سے آگے نکل گئی۔ عمار کچھ کہنے کو تھا کہ بائیں ہاتھ کی گلی سے ایک سفید کار اسی تیزی سے نکلی اور ان کی گاڑی کے گرد نیم دائرہ بناتی ہوئی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ عامر نے بڑی چابک دستی سے پہلو بچا کر راستہ دیا، ورنہ ٹکر ہو گئی ہوتی۔

''اُفوہ! کیا آفت آئی ہے ان ہوابازوں پر۔'' عمار نے کہا۔

''سفید کار نیلی وین کا پیچھا کر رہی ہے۔'' عامر نے بھی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا۔

''نہ صرف پیچھا کر رہی ہے بلکہ اسے سڑک پر سے دھکیل کر نشیب میں اُتارنا چاہتی ہے۔ کوئی چکر معلوم ہوتا ہے، ذرا تیز چلو۔'' عمار نے چونکتے ہوئے کہا۔

اب دونوں گاڑیوں میں بالشت بھر فاصلہ رہ گیا تھا۔ پھر ٹکرانے کی آواز گونجی اور آنکھ جھپکتے میں نیلی گاڑی لڑھکتی ہوئی سڑک سے نیچے ایک کھڈے میں جا گری۔ سفید کار فراٹے بھرتی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

''تم جلدی سے اُتر کر دیکھو، ڈرائیور کا کیا حال ہے۔ میں سفید کار کے پیچھے جاتا ہوں۔'' عامر نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔ وہ عمار کو اُتار کر آگے بڑھ گیا اور گاڑی کو پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔

اب دونوں گاڑیوں میں چند گز کا فاصلہ تھا۔ آگے والے ڈرائیور نے مُڑ کر دیکھا تو عامر کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ جس چہرے کی جھلک اس نے لحظہ بھر کو دیکھی، وہ کسی زندہ انسان کا چہرہ نہ تھا۔ اس کی رنگت بالکل سفید تھی اور آنکھیں حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں، جیسے مدتوں پُرانی لاش ہو مگر عامر نے تعاقب جاری رکھا۔ بدقسمتی سے راستے میں ریلوے کراسنگ آ گئی۔ کوئی گاڑی آ رہی تھی۔ پھاٹک بند ہوتے ہوتے آگے والی گاڑی تیزی سے نکل گئی، لیکن

عامر کو رُکنا پڑا۔

گیٹ دوبارہ کھلا تو سفید گاڑی کا دُور دُور تک پتا نہ تھا۔ مجبوراً عامر کو واپس آنا پڑا۔ وہ عمار کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ایک لڑکا گھاس پر لیٹا ہوا ہے۔ اس کے ماتھے پر چوٹ آئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ وہ انھی کی عمر کا تھا۔

"یہ بے ہوش ہے۔ اسے اسپتال پہنچانا پڑے گا۔" عمار نے کہا۔

دونوں نے مل کر اسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ زخم گہرا تھا مگر ہڈی بچ گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے ایکسرے لیا، مرہم پٹی کی۔ لڑکے کو جلد ہی ہوش آ گیا اور اسے جانے کی اجازت مل گئی۔ لڑکے نے، جس کا نام امجد تھا، دونوں بھائیوں کا شکریہ ادا کیا۔

"آپ کی بروقت مدد سے میری جان بچ گئی۔" اس نے پچھلی سیٹ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"بھیا، تمہاری گاڑی تو بیکار ہو گئی ہے، تمہیں کہاں جانا ہے؟ ہم پہنچا آئیں گے۔" عامر نے کہا۔

"جی، میں اس طرف ایک ضروری کام سے آیا تھا۔ اگر آپ یہیں کہیں رہتے ہیں تو شاید میری کچھ مدد کر سکیں۔"

"ہاں! کہیے، کیا کام ہے؟ آپ کی مدد کر کے ہمیں خوشی ہو گی۔" عمار نے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ اس علاقے میں پاکستان کے دو مشہور سراغ رساں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ایک معاملے میں ان کی مدد درکار ہے۔ آپ مجھے ان کا پتا بتا دیجیے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔" امجد نے کہا۔

عمار قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ عامر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ امجد حیران ہو کر سیدھا ہو بیٹھا اور ان کا منہ تکنے لگا۔

"تو سمجھ لیجیے آپ نے انہیں ہماری مدد کے بغیر ہی ڈھونڈ لیا۔" عمار بولا۔

"ہم دونوں بھائی وہی ہیں جن کی تمہیں تلاش ہے۔ میرا نام عامر ہے اور یہ میرا چھوٹا بھائی عمار ہے۔" عامر نے اپنا تعارف کرایا۔

"ہاں! یہی نام سنے تھے میں نے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔" امجد کہنے لگا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر چلیں۔ وہاں کھانے کی میز پر باتیں ہوں گی۔" عامر نے کہا اور گاڑی کا رُخ گھر کی طرف موڑ دیا۔

وہ گھر پہنچے تو ان کی پھوپھی منصورہ نے ان کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا: "کہاں رہ گئے تھے تم لوگ؟ اور یہ......؟ یہ لڑکا کون ہے؟ معلوم ہوتا ہے یہاں بھی تم نے وہی حرکتیں شروع کر دی ہیں۔ تم رہ ہی نہیں سکتے دوسروں کے پھڈے میں ٹانگ اڑائے بغیر۔"

دونوں لڑکے مسکراتے ہوئے، امجد کو ساتھ لیے بیٹھنے کے کمرے میں چلے گئے۔ ان کی امی امجد کو زخمی دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔ لڑکوں نے انہیں سارا واقعہ سنایا تو انہوں نے جلدی سے ان کے لیے کھانا لگا دیا۔ امجد ان سب کی خوش اخلاقی سے بے حد متاثر ہوا اور جلد ہی ان کے ساتھ گھل مل گیا۔

"اچھا! اب بتایئے، کیا مشکل درپیش ہے؟" عامر نے کھانے کے بعد صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

امجد بولا: "پاکستان سے میرے ایک چچا آئے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ آپ دونوں بھائیوں نے ان کے ایک کیس کی تحقیقات کی تھی اور چند ہی روز میں مجرموں کو پکڑوا دیا تھا۔ اب میں نے سنا کہ آپ یہاں آئے ہیں تو سوچا کہ آپ سے مدد چاہوں۔ میں آپ کی تلاش میں نکلا تو وہ سفید کار والا میرے پیچھے لگ گیا۔ میں نے اسے بہت طرح دینا چاہی مگر آخر کار اس کا داؤ لگ گیا اور اس نے میری گاڑی کو ٹکر مار کر کھڈے میں پھینک دیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ آپ وہاں موجود تھے، ورنہ خبر نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔"

"خدا کی پناہ! وہ انسان تھا یا کوئی پُرانی مصری ممی جو اپنی قبر سے نکل کر آ گئی ہو۔ آپ نے اس کی صورت دیکھی تھی؟ بخدا میرے جسم میں تو سنسنی دوڑ گئی۔ کاغذ جیسا سفید، بے رنگ چہرہ...... حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں...... بالکل کسی لاش کی طرح۔" عامر نے کہا۔

"یہی وہ شخص ہے۔" امجد نے چونک کر کہا۔

"تو کیا آپ اسے جانتے ہیں؟" عامر نے پوچھا۔

"اسے تو نہیں، اس کے متعلق جانتا ہوں۔ اس کی صرف ایک جھلک میں نے آج ہی دیکھی ہے جیسا کہ آپ نے کہا، بڑی بھیانک صورت تھی۔ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے میرے۔" امجد نے بتایا۔

"اچھا! اب شروع سے بات کیجیے۔" عمار نے بے صبری سے کہا۔

امجد بولا: "یہاں سے بیس بائیس میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے، توجا۔ میرے والد صاحب اس قصبے کے جانوروں کے اسپتال

کے انچارج ہیں۔ ہم نے حال ہی میں وہاں ایک بنگلا خریدا تھا۔ جس کا نام گرین ولا ہے۔ یہ بنگلا آبادی سے الگ تھلگ، جنگل کے کنارے واقع ہے۔"

"آپ بات چیت اور شکل وصورت سے ہمارے ہم وطن لگتے ہیں۔" عامر نے کہا۔

"جی ہاں!" امجد نے جواب دیا۔"ہم پانچ سال قبل پاکستان سے یہاں آئے تھے اور اب ابو کی ریٹائرمنٹ تک یہیں رہیں گے۔ تو خیر، کچھ عرصہ ہوا کسی نامعلوم شخص نے میرے والد سے کہا کہ وہ اپنا مکان اس کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ ان کے انکار پر اس نے خطوں اور فون کے ذریعے انہیں دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ اسی عرصے میں میرے ابو اور امی کو وطن جانا پڑا اور وہ مجھے اپنے ایک افریقی دوست کے ہاں چھوڑ کر پاکستان چلے گئے، کیوں کہ میرے امتحان نزدیک تھے اور مجھے چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔

"پچھلے ہفتے کا ذکر ہے کہ ہمارے مکان کے پیچھے جنگل میں آگ لگ گئی۔ شہر بھر کے فائر بریگیڈ جمع ہو گئے اور کئی گھنٹے کی جدوجہد سے آگ پر قابو پایا جا سکا۔ لوگوں کا قیاس تھا یہ آتش زدگی اتفاقی حادثہ تھی، مگر مجھے یقین ہے کہ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔"

"آپ کس بناء پر یہ سوچتے ہیں کہ آگ دانستہ لگائی گئی؟ جنگل کو جلانے سے کسی کا کیا فائدہ؟" عمار نے پوچھا۔

"جنگل میرے گھر کے عین پیچھے ہے۔ آگ ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے لگائی گئی کہ ہم ڈر کر مکان بیچنے پر آمادہ ہو جائیں۔ میرے پاس اس یقین کی وجہ موجود ہے۔ جس روز میں اور میرا دوست ٹوگو ابو کے دوست کے گھر جانے کے لیے اپنا سامان گاڑی میں رکھ رہے تھے تو فون کی گھنٹی بجی اور کسی شخص نے مجھے دھمکی دی کہ اگر ہم نے مکان بیچنے کی ہامی نہ بھری تو مکان جلا دیا جائے گا۔" امجد نے کہا۔

"اس آواز کو آپ پہچان سکتے ہیں؟" عامر نے پوچھا۔

"ہاں! دوبارہ سنوں تو ضرور پہچان لوں گا۔ عجیب قسم کی غنغنی آواز تھی، جیسے کوئی ناک دبا کر بول رہا ہو۔" امجد نے بتایا۔

"اچھا! یہ ٹوگو کون ہے؟ کیا وہ آپ کے ساتھ رہتا ہے؟" عامر نے کہا۔

امجد نے بتایا کہ ٹوگو ایک افریقی لڑکا ہے۔ اس کے والدین فوت ہو گئے ہیں۔ اکیلا اور لاوارث ہے۔ میری امی نے ترس کھا کر اسے گھر میں رکھ لیا ہے۔

"اس غنغنی آواز والے آدمی نے پھر بھی کبھی آپ کو فون کیا؟" عامر نے پوچھا۔

"جی ہاں! آگ لگنے سے چند روز پہلے اس کا پھر فون آیا تھا۔ اس نے کہا کہ فلاں مکان کے کمرہ نمبر 415 کے پتے پر اطلاع دو کہ مکان کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں اور ٹوگو اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچے مگر اس کمرے میں کوئی نہیں رہتا۔ چوکیدار نے بتایا کہ یہ کمرہ تو سال بھر سے خالی پڑا ہے۔"

"ہو سکتا ہے رات کے وقت کوئی چوری سے وہاں آتا ہو" عمار نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" امجد نے تائید کی اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک بولا۔"اب میری آپ دونوں سے یہ درخواست ہے کہ اس معاملے کی تحقیقات کا ذمہ لیں اور اس سے پہلے کہ میرا مکان جلا دیا جائے، ان لوگوں کو بے نقاب کریں جو ہمیں پریشان کر رہے ہیں۔"

"کیا کسی اور نے بھی مکان کے متعلق کبھی خریدنے کی بات کی تھی؟" عامر نے پوچھا۔

"ہاں! ایک مقامی وکیل جم لنڈن نے بھی اپنی ایک موکل کمپنی کی طرف سے بات کی تھی۔" امجد نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، ہم آپ کا کیس لینے کو تیار ہیں اور سب سے پہلے اس پُراسرار ڈرائیور سے شروع کرتے ہیں۔ آپ کو اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے، بتائیے۔" عمار نے کہا۔

امجد قدرے تامل سے بولا:"اس کا معاملہ کچھ مختلف ہے۔ یعنی...... وہ ...... اس کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے میں ڈرتا ہوں...... اور پھر آپ یقین بھی نہیں کریں گے۔"

"عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ پہیلیاں نہ بجھوایئے۔ صاف صاف کہیے۔" عامر نے ذرا تلخی سے کہا تو امجد نے رُکتے رُکتے جواب دیا:

"آپ میری بات کا یقین کر لیں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے۔ وہ زومبی ہے، یعنی زندہ لاش۔" (باقی آئندہ)

طالب علم

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

(علامہ اقبالؒ: ضرب کلیم)

پ	چ	ی	ن	ی	چ	ر	ا	د	ب
ہ	غ	د	ض	س	ل	ش	ء	ف	ط
ج	و	ل	و	ن	گ	ی	خ	ل	ز
ا	ڑ	ٹ	س	ل	ژ	ا	ک	ط	ی
ء	ظ	ک	ف	ک	م	ن	ل	ی	ر
ف	و	ے	ن	ص	ا	ض	و	م	ہ
ل	ت	ج	و	ا	ث	ب	ن	ف	ق
ہ	ڈ	ز	س	ن	ظ	ی	ج	ذ	ص
ج	ا	و	ت	ر	ی	ش	ی	ق	گ
چ	ر	م	گ	ع	ح	ک	ر	د	ا

آپ نے حروف ملا کر دس مصالحہ جات کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

لونگ، زیرہ، مرچ، کلونجی، دارچینی، سونف، جائفل، نمک، جاوتری، ادرک

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اس دفعہ کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ اس میں تین شہزادے ایک شہزادی، خطرناک سمندری بوڑھا کہانیاں بے حد پسند آئیں۔ اللہ کرے یہ رسالہ دن دگنی رات چگنی ترقی کرے۔ آمین! (آیان نسیم)

تعلیم و تربیت کی ساری ٹیم کو السلام علیکم! ہر ماہ کی طرح اس بار بھی کسی ایک کہانی کو بہترین کہنا ناانصافی ہے۔ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ پچھلے ماہ امتحانات میں میری پہلی پوزیشن آئی۔ کیا آپ مجھے مبارک باد نہیں دیں گے؟ اللہ اس رسالے کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا کرے۔ آمین! (مریم رضوان، راول پنڈی)

☆ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔

میں آپ کے رسالے کا بہت شوقین ہوں۔ میں اسے آپ کا نہیں، اپنا رسالہ کہوں گا۔ میں بازار سے رسالہ خریدتا ہوں اور وہ دُکان تقریباً گھر سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ مجھے تقریباً تین چکروں کے بعد رسالہ ملتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس کا بہت شوقین ہوں اور مجھے اگر تین کی جگہ چھ چکر بھی لگانے پڑیں تو میں تیار ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کی ترقی اور مقبولیت میں کچھ اپنا کردار ادا کروں اور اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے آپ کو دوسرا خط لکھا ہے۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ میرے اس خط کا جواب ضرور دیں گے۔ آپ کے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔ (رانا شاہ زیب احمد، چنیوٹ)

☆ خط لکھنے کا بہت شکریہ۔ اپنی تحریریں ضرور بھیجیں۔

السلام علیکم! ایڈیٹر صاحبہ، کیسی ہیں آپ؟ اُمید ہے کہ تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہو گی۔ اس مہینے کا رسالہ بہت عمدہ تھا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ محاورہ کہانی کا سلسلہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ تمام کہانیاں بہت اچھی اور سبق آموز تھیں۔ خاص طور پر دولت کا بیچاری اور ٹرین چھوٹ گئی اور خطرناک سمندری بوڑھا بہت عمدہ تھیں۔ ہمارے گھر میں یہ ماہنامہ بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ آپ نیا ناول کب شروع کر رہے ہیں؟ براہ مہربانی فرعون سے متعلق بھی چند معلومات فراہم کریں۔ اُمید ہے میرا یہ خط آپ کی ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنے گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اللہ آپ کا محافظ و نگہبان۔ (عائشہ صدیقہ، جہلم)

☆ اس ماہ نیا ناول ''زندہ لاش'' شامل کیا گیا ہے۔

السلام علیکم! اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گی۔ سب سے پہلے تو میرا خط شائع کرنے کا شکریہ۔ کہانی تین شہزادے ایک شہزادی، اور ٹرین چھوٹ گئی اور خاص طور پر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا صفحہ پڑھ کر تو بہت ہی مزہ آیا۔ ایک اور بات کہ کسی بھی انعامی سلسلے میں کام یاب لوگوں میں نام تو آ جاتا ہے لیکن کبھی انعام نہیں نکلا، کوئی انعام نکلنے کا گر بتائیں۔ میں اس بار بھی تحریریں بھیج رہی ہوں، پلیز شائع کریں۔ پچھلی مرتبہ تحریریں معیاری تھیں لیکن آپ نے شائع نہیں کیں۔ میں ناراض تو نہیں ہوں، البتہ میری بڑی خواہش ہے کہ میری بھی تحریریں شائع ہوں۔ کیا اگر ہم مارچ کے مہینے میں تحریریں بھیجتے ہیں تو وہ دو تین مہینوں بعد شائع ہو سکتی ہیں یا جس مہینے تحریریں بھیجیں اس سے اگلے مہینے ہی شائع ہوتی ہیں؟

ہمارا پیارا رسالہ تعلیم و تربیت
ستاروں میں ستارہ تعلیم و تربیت
تعلیم و تربیت کی ٹیم رہے شاد
تعلیم و تربیت زندہ باد

(مشیرہ سلیمان بٹ)

☆ تحریریں چھپنے کے لیے انتظار کی زحمت تو اٹھانا پڑے گی، خط لکھنے کا بہت شکریہ۔

بچوں کی تربیت میں تعلیم و تربیت کو بنیادی شرف حاصل ہے۔ تعلیم و تربیت جتنی مکمل اور اعلیٰ ہو گی، اسی قدر شخصیت بلند و بالا ہو گی۔

ڈیئر آپی! میں نے آپ اور ماں باپ کی دعاؤں سے دوسری پوزیشن حاصل کر لی ہے۔ میں نے کئی بار خط بھیجا ہے لیکن آپ نے انہیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اگر اس بار شائع نہیں کیا تو میں کبھی بھی نہیں بھیجوں گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تعلیم و

تربیت کو بہت زیادہ ترقی دے۔ آمین! (محمد عرفان آفریدی، جمرود)

السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب، کیسے ہیں آپ؟ اس ماہ کا رسالہ بہت اچھا تھا اور اسی وجہ سے میں لکھنے پر مجبور ہوگئی۔ ہمیشہ کی طرح ٹائٹل اس دفعہ بھی زبردست تھا۔ حمد و نعت بھی بہت اچھی تھی۔ درسِ قرآن و حدیث تو مجھے بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ تین شہزادے ایک شہزادی، کھڑکھاند گروپ، خطرناک سمندری بوڑھا، آیئے مسکرایئے، سانجھا غم، زیادتی اور نظمیں ٹاپ پر تھیں۔ دو ماہ بعد شرکت کر رہی ہوں کیوں کہ پیپرز تھے۔ میں نے آٹھویں جماعت میں اوّل پوزیشن حاصل کی ہے۔ تعلیم و تربیت کا ہر ماہ شدّت سے انتظار کرتی ہوں۔ آپ خوش رہیں، آباد رہیں۔ آپ پر سلامتی ہو۔ اُمید ہے خط شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو، اللہ حافظ! (حفصہ اعجاز، صوابی)

ڈیئر ایڈیٹر السلام علیکم! اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو ترقی پہ ترقی عطا فرماتا جائے۔ (آمین!) اپریل کا شمارہ ملا، پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سب سلسلے بہت اچھے تھے۔ کھڑکھاند گروپ نے تو بہت ہنسایا۔ تین شہزادے ایک شہزادی، زیادتی اور سانجھا غم بہت سپرہٹ تھیں اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے تاج محل بنانے کا موقع دیا تو سر سید احمد کی طرح کا تاج محل بناؤں گا۔ (انشاء اللہ!) اللہ کرے اس دفعہ آپ کی ردی کی ٹوکری کو ہی مجھ پر ترس آ جائے، ہر دفعہ میرا خط آپ کی ردی کی ٹوکری ہڑپ کر جاتی ہے۔ (فدا حسین، اوکاڑہ)

اس ماہ کا رسالہ ایک دم زبردست تھا۔ سرورق بھی عمدہ تھا۔ اداریہ میں سبق آموز واقعہ پڑھنے کو ملا۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ ایک تھی۔ کھڑکھاند گروپ، سندباد جہازی مزے دار سلسلے ہیں، انہیں جاری رکھیے گا۔ اجلا بچپن روشن بڑھاپا اور آگس ہا کی معلومات سے بھرپور مضامین تھے۔ آپ نے میرا خط کچھ ماہ سے شائع نہیں کیا، اس لیے تھوڑا سا ناراض ہوں۔ اب کوئی نیا دلچسپ ناول شروع کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی پوری ٹیم کو صحت اور ترقی عطا فرمائے۔ آمین!

(محمد افضل انصاری، چوہنگ لاہور)

میں اس وقت چھٹی کلاس میں تھا جب پہلی بار اپنے محبوب رسالے سے تعارف ہوا۔ اس کے بعد ایف ایس سی تک ہر ماہ تعلیم و تربیت میری لائبریری کی زینت بنا رہا۔ 2010ء میں میرا داخلہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں ایم بی بی ایس میں ہو گیا۔ پھر اپنی گوناگوں مصروفیات اور تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ تعلیم و تربیت نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ میں اب علامہ اقبال میڈیکل کالج کے سالانہ مجلّہ ''شاہین'' کا ایڈیٹر بھی ہوں۔ گزشتہ دنوں ایک ضروری کام سے بک شاپ پر جانا ہوا، وہاں اچانک میری نظر تعلیم و تربیت کے شمارہ اپریل پر پڑ گئی۔ میں نے خریدنے میں دیر نہیں لگائی۔ شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ گزشتہ چند سالوں میں تعلیم و تربیت میں کافی مثبت تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

شمارہ اپریل میں حمد و نعت اور درسِ قرآن و حدیث حسبِ معمول لاجواب تھیں۔ اوجھل خاکے، کھیل دس منٹ کا، بوجھو تو جانیں، کھوج لگایئے، بلاعنوان اور دماغ لڑاؤ بہت ہی مفید اور معلوماتی ہیں۔ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس کے علاوہ زیادتی، تین شہزادے ایک شہزادی اور سندباد جہازی کا سفر بہت پسند آیا۔ علامہ اقبال میڈیکل کالج کی نسبت سے علامہ اقبال کے متعلق تمام تحاریر بہت پسند آئیں۔ میں اب اپنے فیملی اور دوستوں کے بچوں کو تعلیم و تربیت پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ تمام نئے لکھاری بہت اچھے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس رسالے کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے۔ آمین! آپ براہِ کرم میرا یہ خط شائع فرمائیں۔

(محمد شفقت سیال، جھنگ)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بڑے مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

حافظ احمد محمود۔ محمد زبیر جمشید علی، جہانیاں خانیوال۔ ثمن جمیل، اسلام آباد۔ جویریہ ادریس، سیال کوٹ۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ اظہر عباس، چنیوٹ۔ محمد شکیب مسرت، بہاول پور۔ محمد حمزہ لغاری، میانوالی۔ محمد بلال عرف سیفی، سیال کوٹ۔ عائشہ محبوب، لاہور۔ محمد حنظلہ سعید، حمنہ حور، فیصل آباد۔ سیدہ تحریم مختار، عثمان اکرم، ملتان۔ طوبیٰ زہرہ، جھنگ صدر۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ فائقہ عابد، مریم ثاقب، حافظ حذیفہ عابد، الٰہ آباد۔ عبدالرحیم، پیر محل۔ سدرہ رحمٰن، بہاول پور۔ ناظرہ مقدس، شرق پور۔ مزمل علی جعفری، عزیز آباد۔ مریم اعجاز، لاہور۔ محمد قمرالزمان صائم، خوشاب۔ ابرار الحق، تسنیم زاہدہ، راجہ جنگ۔ محمد طلحہ حسن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عشیۃ الرفیہ، لاہور۔ سامیہ رمضان اعوان، شیخوپورہ۔ ثمین سلطان، فیصل آباد۔ عروج صادق۔ ذیشان رضا ام کلثوم۔ حارث، وار برٹن۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ وردہ زہرہ، جھنگ صدر۔

چاغی یوم تکبیر

پاکستان کے سب سے بڑے رقبے والے صوبے بلوچستان میں چاغی نام کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو آج دُنیا بھر میں جانا پہچانا حوالہ ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ مقام اس علاقے کو کیسے ملا؟ جی ہاں! یہیں پر پاکستان نے 28 مئی 1998ء کو 5 ایٹمی دھماکے کیے۔ اس کے دو روز بعد 30 مئی 1998ء کو ایک اور ایٹمی دھماکہ کر کے پاکستان اسلامی دُنیا کا پہلا اور دُنیا کا ساتواں ایٹمی طاقت والا ملک بن گیا۔

چاغی کا صدر مقام نوشکی ہے جو کوئٹہ سے تقریباً سو میل دُور قومی شاہراہ آر سی ڈی پر واقع ہے۔ یہ 1896ء میں ضلع بنا۔ یہاں بلوچی اور براہوی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس علاقے کی سرحدیں ایران اور افغانستان کے ساتھ ملتی ہیں۔ ایک اور خاص بات جو اس علاقے کی ہے، وہ یہ کہ یہاں ماربل اور اونیکس (Onyx) کے ذخائر بکثرت موجود ہیں۔ اس ضلع کا رقبہ پچاس ہزار کلو میٹر سے زائد ہے۔

لمبوتری شکل کے اس علاقے کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی ضلع خاران ہے جہاں مغل بادشاہ نصیر الدین ہمایوں نے ایک جنگ میں شکست کے بعد پناہ حاصل کی تھی۔ یہیں نور الدین محمد جہانگیر کی چہیتی ملکہ نور جہاں پیدا ہوئی تھی۔

چاغی ضلع کے اہم شہروں میں صدر مقام نوشکی کے علاوہ دال بندین، تفتان اور سیندک شامل ہیں۔ نوشکی شہر سے جنوب میں چند کلو میٹر کے فاصلے پر راس کوہ کا پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے جو جنوب مغرب کی سمت دو سو کلو میٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ راس کوہ ضلع چاغی کی جنوبی سرحد کا کام بھی کرتا ہے۔ اس کے پار ضلع خاران کا صحرائی علاقہ ہے۔ راس کوہ پہاڑی پر ہی پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے۔

پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کی داستان کا آغاز 1971ء کی اس پاک بھارت جنگ سے ہوتا ہے جب 16 دسمبر کی شام جب ڈھاکہ کے ریس کورس گراؤنڈ سے دُنیا نے یہ منظر دیکھا کہ پاکستانی فوج نے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جنگ میں فتح کے ساتھ شکست کے لیے ہر سپاہی تیار رہتا ہے، مگر جب دشمن ملک کے جنرل نے پاکستان کے جنرل نیازی کے سینے سے قومی بیج جس نفرت سے نوچا، اس نے سب ہی کو رنجیدہ کر دیا۔ یہی منظر وطن سے دُور ہالینڈ میں موجود ایک پاکستانی ایٹمی سائنس دان بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں نفرت کا شعلہ بھڑکا۔ اس نے سوچا کہ دشمن آئندہ بھی یوں ہی میرے وطن کا شیرازہ بکھیرتا رہے گا۔ اس سے چھ سال قبل 1965ء میں بھی وہ ایک جنگ ہم پر مسلط کر چکا ہے۔ اس محب وطن سائنس دان کی نفرت میں اس وقت مزید اضافہ ہوا، جب دشمن نے 1973ء میں پہلا ایٹمی دھماکہ کر کے خطے کے امن کو برباد کر دیا۔

دشمن اپنی طاقت کے نشے میں اپنے پڑوسی ملک پاکستان کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ یہ بات سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم اور ان کے رفقاء کو بھی اس صورت حال نے پریشان کر رکھا تھا۔ ہالینڈ میں موجود جوہری سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان جب چھٹیوں پر پاکستان آئے تو سابق وزیر اعظم نے انہیں اس مسئلے کے حل کے لیے ملاقات کی دعوت دی۔ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بڑھتا گیا اور

پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کا عملی کام شروع ہوا۔ ہر کام کی طرح ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے اس عزم میں دیوار بننے کے لیے غیروں کے ساتھ ساتھ اپنے بھی موجود تھے مگر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے عہد کیا تھا کہ میں اپنی ہر صلاحیت وطن کے لیے استعمال کروں گا۔ اب میرا جینا مرنا اسی پاکستان کے لیے ہے۔

پاکستانی فوج اور اس کے سربراہان بھی شروع دن سے ہی اس منصوبے کی کامیابی کے لیے اپنے مکمل تعاون کے ساتھ موجود تھے۔ بالآخر وہ دن آ ہی پہنچا جب پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی۔ ایک اسلامی ملک کا ایٹمی طاقت بنا مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ کئی ایشیائی ممالک کی آنکھوں میں بھی کھٹک رہا تھا۔

پھر ایک دن ایسا آیا جب پاکستان کو ایٹمی صلاحیت کے مظاہرے کا موقع مل گیا۔ یہ موقع بھی ہمارے دشمن نے فراہم کیا۔ اس نے مئی 1998ء میں ایک بار پھر ایٹمی دھماکہ کر کے خود کو خطے کا اکلوتا ایٹمی طاقت ثابت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس وقت وزیراعظم محمد نواز شریف تھے۔ اب پاکستان کے پاس ایٹمی دھماکہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کیوں کہ دشمن پر جب بھی خوف طاری نہ ہو، اس کے قدم روکنا مشکل تھا۔ آخرکار دُنیا کو یقین کرنا پڑا کہ پاکستان دُنیا کا ساتواں اور اسلامی دُنیا کا پہلا ایٹمی طاقت رکھنے والا ملک بن چکا ہے۔

یہ 28 مئی 1998ء کا ایک خوش گوار دن تھا جب پاکستان نے ڈاکٹر عبدالقدیر کی محنت سے اور محمد نواز شریف کی سربراہی میں ایٹمی دھماکہ کر کے دشمن کے اٹھنے والے ناپاک قدم روک دیئے تھے۔ اس دن پاکستان نے چاغی کے مقام پر 5 ایٹمی دھماکے کیے اور پھر دو دن بعد 30 مئی 1998ء کو ایک اور دھماکہ کیا۔ یہ پاکستان کی ایک بڑی فتح تھی، جس پر ساری قوم خوش تھی۔ قوم نے بلاشبہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ''محسن پاکستان'' کا خطاب دیا۔ وہ اس اعزاز کے بجا طور پر حق دار بھی تھے۔ انہوں نے دن رات آرام کی پرواہ کیے بغیر ملک کو ایٹمی طاقت بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپریل 1936ء میں عبدالغفور خان کے گھر بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد استاد تھے۔ ان کی تربیت میں والد کے ساتھ ساتھ والدہ زلیخا بیگم کا بھی بھرپور ہاتھ تھا۔ مذہبی ماحول تھا۔ بچپن ہی سے وہ نماز روزے کے پابند تھے۔ دُنیاوی تعلیم کے ساتھ قرآن مجید بھی پڑھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر کے قریب موجود پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ چوتھی جماعت میں انہوں نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔

میٹرک کے بعد 1952ء میں وہ پاکستان آ گئے۔ کراچی میں انہوں نے ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ لیا۔ 1957ء میں بی ایس سی امتیازی نمبروں کے ساتھ کیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد مقابلے کا امتحان پاس کر کے انسپکٹر اوزان و پیمانہ جات مقرر ہوئے۔ اسی دوران ہالینڈ جانے کا موقع ملا۔ وہاں سے ٹیکنیکل یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا اور 1967ء میں پاکستان آ گئے۔ پھر دوبارہ ہالینڈ چلے گئے۔ بعد میں بیلجیم کی لیوون یونیورسٹی سے طبعی فلزات میں پی ایچ ڈی کیا۔ اس کے بعد انہیں ایمسٹرڈم، ہالینڈ کی معروف فرم فزیکل ڈائنامیکل ریسرچ لیبارٹری کا حصہ بنے۔

انہوں نے ہالینڈ میں پُرآسائش زندگی چھوڑ کر پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کا عزم کیا تو ان کی تنخواہ اور سہولیات ہالینڈ کے مقابلے میں انتہائی کم تھی۔ وہ اکثر بھوپال سے پاکستان ہجرت کے دوران خود کے ساتھ پیش آنے والے تلخ تجربات دہراتے تھے۔ سفر کے دوران ہندو پولیس اور ریلوے ملازمین لٹے پٹے مسافروں کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے تھے، وہ انتہائی ذلت آمیز اور ناقابلِ برداشت ہوتا تھا۔ ٹکٹ چیکر، چیکنگ کے بہانے سامان، یہاں تک کہ عورتوں کے کانوں سے سونے کی بالیاں تک اتروا لیتے تھے۔ احتجاج کرنے پر لاتوں، جوتوں اور ڈنڈوں کی بارش کر دی جاتی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا قلم بھی چھین لیا گیا۔ وہ اس سلوک کو کبھی فراموش نہیں کر سکے۔

ایک بار ایک دست شناس نے ان کے بارے میں کہا تھا: ''آپ بہت جلد ولایت چلے جائیں گے۔ وقت بڑا کٹھن اور محنت طلب گزرے گا مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی آرزو پوری ہو گی۔ شادی غیر ملکی لڑکی سے ہو گی۔ تکمیل تعلیم کے بعد کچھ عرصہ فنی کام کریں گے۔ پھر وطن واپس آئیں گے اور اپنے ملک میں ایسا کارنامہ سرانجام دیں گے کہ پاکستان کا نام دُنیا میں روشن ہو جائے گا۔ ملک میں بے حد عزت ملے گی۔ لوگوں کے دل آپ کا نام سن کر محبت کے جذبات سے اُبھریں گے۔''

یہ تمام باتیں سچ ثابت ہوئیں۔ پاکستان نے جب ایٹمی دھماکہ کیا تو اس وقت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ان کے والد کی وہ نصیحتیں بھی یاد آئی ہوں گی جو انہوں نے بچپن میں کی تھیں۔ ''قدیر بیٹے! تجھے اس زبوں حال قوم کا سر اُونچا کرنا ہے۔ دیکھ لینا قیامت کے دن رسول عربیؐ کی بارگاہ میں جب میں حاضر ہوں تو میرا سر شرمندگی سے نہیں جھکنا چاہیے۔ میرا انہیں اسلام کا مان رکھنا۔ ☆☆☆

سند باد جہازی کا چھٹا سفر

پُراسرار دریا

کاشف ضیائی

دوستو! آپ یقیناً اس بات پر حیران ہوتے ہوں گے کہ میں اتنے سفر کیوں کرتا ہوں۔ آپ تو کیا کبھی کبھی مجھے خود بھی اپنی اس ہنگامہ خیز زندگی پر تعجب ہوتا ہے لیکن کیا کروں؟ شاید میری قسمت میں ہی اتنے سفر لکھے ہیں۔ جبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ میں جب بھی کسی سفر سے واپس آتا ہوں، تھوڑا عرصہ گھر میں آرام کرتا ہوں اور پھر نئے سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

آج میں آپ کو اپنے چھٹے سفر کی داستان سناتا ہوں۔ اس مرتبہ بھی پچھلے سفر کی طرح میں بصرہ سے بحری جہاز میں سوار ہوا اور نامعلوم علاقوں کی طرف چل نکلا۔ پہلے چار دن تو خیریت سے گزرے، پھر ایک رات سمندر میں شدید طوفان آگیا۔

سمندری طوفان کی اپنی ہی ایک مصیبت ہوتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں، بجلی کڑکتی ہے، بارش برستی ہے اور نیچے موجیں بپھرتی ہیں۔ غرض اس قسم کے طوفانوں میں زندہ سلامت بچ جانا، بڑی بات ہوتی ہے۔ طوفان ساری رات جاری رہا۔ ہم زندہ سلامت تو بچ گئے لیکن ایک بدقسمتی یہ ہوئی کہ کپتان راستہ بھول گیا۔ پورے دو دن جہاز سمندر میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا، پھر اگلے دن کپتان نے نائب کپتان کے مشورے سے جہاز کو شمالی رُخ پر ڈال دیا۔

جہاز شمال کی سمت سمندر میں کئی دن آگے بڑھتا رہا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رُخ بھی غلط ہے۔ پھر دوبارہ کپتان اور نائب کپتان کا مشورہ ہوا اور اب کی بار جہاز کو شمال سے مشرق کی سمت موڑ دیا گیا۔

دوسرے مسافروں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اس بات پر تشویش تھی کہ معلوم نہیں یہ رُخ بھی صحیح ہے کہ نہیں۔ کپتان اور نائب کپتان بھی بے چینی کا شکار تھے لیکن بہرحال ہم سمندر میں آگے بڑھتے جارہے تھے۔ ان سب حالات میں ایک بات اطمینان کی تھی کہ جہاز میں خوراک کا کافی ذخیرہ تھا اور ہم کم از کم ایک ماہ تک اپنی ضروریات بڑی آسانی سے پوری کر سکتے تھے۔

اس سے اگلے دن کا واقعہ ہے کہ صبح کے وقت اچانک کپتان نے اپنی جگہ چھوڑی، اپنی پگڑی عرشے پر پھینکی، اپنی قمیص پھاڑی اور پھر اپنا سینہ کوٹتے ہوئے یوں چیخنے چلانے لگا جیسے دیوانہ ہو گیا ہو۔ سب مسافر حیران ہو گئے۔ دو آدمیوں نے اسے پکڑ کر سیدھا کیا اور پوچھا: ”اللہ کے بندے! تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

وہ روتے ہوئے کہنے لگا: ”ہم لٹ گئے، ہم برباد ہو گئے، سب کچھ تباہ ہو جائے گا، اب کوئی بھی نہیں بچے گا، ہائے ہماری قسمت!“ یہ کہہ کر اس نے سامنے مشرق کی طرف اشارہ کر دیا۔

ہم نے جو گھوم کر مشرق کی طرف دیکھا تو ششدر رہ گئے۔ اس طرف سمندر کے بیچوں بیچ ایک عظیم الشان پہاڑ اسی طرح کھڑا تھا

جیسے ابھی ابھی جادو کے زور سے سمندر میں سے نکل آیا ہو۔ پہاڑ کی چوٹی آسمان سے باتیں کر رہی تھی اور اس کی جڑ میں ایک گہرا سرنگ نما غار تھا۔ سمندر کا پانی اس جگہ اس غار میں ایک دریا کی مانند داخل ہو رہا تھا۔ پہاڑ سے ایک میل کے فاصلے تک ہوا کا دباؤ بہت زیادہ تھا، اسی لیے جو چیز بھی اس ایک میل کے دائرے میں آ جاتی، لہروں کے بہاؤ کی وجہ سے تیزی سے غار میں داخل ہو جاتی اور ہمارا جہاز اس ایک میل کے دائرے میں آ چکا تھا۔ دھند کی وجہ سے کپتان کو صحیح رُخ کا علم نہ ہوا اور اب جہاز تیزی سے پہاڑ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''ہم لٹ گئے، ہم برباد ہو گئے، ہماری زندگی اب تھوڑی دیر کی رہ گئی ہے۔'' کپتان نے پھر وہی بات کہی اور رونے لگا۔ ہم سب کو صورت حال کی سنگینی کا علم ہو گیا اور ہم سب عرشے پر گم صم کھڑے جہاز کو غار کی طرف بڑھتا دیکھ رہے تھے۔

میں اس بات پر حیران تھا کہ یا اللہ! اس پہاڑ کا معاملہ کیا ہے، اس کا سرنگ کی طرح کا یہ غار کیسا ہے اور اس کے دوسری طرف کیا ہے لیکن مجھے یہ سب باتیں کون بتاتا؟ سب لوگ میری طرح اپنے آپ کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

جہاز جوں جوں غار کے قریب ہو رہا تھا، اس کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ غار کے بالکل قریب پہنچ کر اس میں اتنی تیزی آ گئی کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی اڑنے لگا ہو۔ اگلے ہی لمحے جہاز غار کے دھانے سے جا ٹکرایا۔ ایسا زور دار دھماکہ ہوا اور یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ جہازی قلابازیاں کھاتے ہوئے پانی میں گرے لیکن لہروں نے انہیں پھر اوپر اُچھال دیا۔ جہاز کے ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے ہاتھ پاؤں مار کر جلدی سے ایک تختہ پکڑ لیا لیکن حالت یہ تھی کہ کبھی پانی کے اوپر، کبھی نیچے ہوتا تھا۔ لہروں کے شور، سمندری پانی کی جھاگ، مسافروں کی چیخ پکار اور جہاز کی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ آخری منظر جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ میں، جہاز، سامان اور سارے جہازی ہم سب تاریکی میں ڈوب رہے ہیں۔ اس کے بعد مجھ پر غنودگی چھا گئی اور مجھے کچھ پتا نہ چلا کہ میں کہاں ہوں۔

معلوم نہیں میں کب تک بے ہوش رہا لیکن جب مجھے ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ کسی خشک زمین پر لیٹا ہوا ہوں اور سورج میرے سامنے آسمان پر چمک رہا ہے۔ اس کی روشنی سے میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ میری دائیں جانب کوئی بوڑھا آدمی بیٹھا قرآن کی سورتیں پڑھ رہا تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے تلاوت ختم کی اور میرے چہرے پر دم کر دیا۔ پھر میری زبان میں کہنے لگا: ''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو اپنے یاد کرنے والے کو نہیں بھولتا۔''

یہ فقرہ سن کر مجھے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ پہلی یہ کہ میں زندہ ہوں اور دوسری یہ کہ مسلمانوں کے درمیان ہوں۔ نہیں معلوم کہ ان دونوں خوشیوں کا اثر تھا یا کمزوری کا غلبہ کہ میں دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

پھر جب مجھے ہوش آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں کسی کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔ میرے اردگرد کئی حبشی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی رنگت سیاہی مائل اور ناک چپٹی تھی۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ان میں سے ایک کہنے لگا: ''گھبراؤ مت نوجوان! تم بڑے کریم لوگوں میں ہو۔'' یہ سن کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا اور میں شکریہ بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ اس کے بعد ان میں سے ایک نے مجھے یخنی کا پیالہ لا تھمایا۔ میں نے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پیا۔ جب ذرا طاقت بحال ہوئی تو میں پوری طرح اُٹھ بیٹھا۔ وہ سب مجھے بھائی چارے کے جذبے سے دیکھنے لگے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں اپنی ساری داستان کہہ سناؤں۔ چناں چہ میں نے چھٹے سفر کی ساری کہانی شروع سے اب تک انہیں سنا دی۔ انہوں نے پہلے تو حیرانی کا اظہار کیا، پھر تسلی دی اور مجھے کہا کہ صبح وہ مجھے اپنے بادشاہ کے پاس لے چلیں گے۔

اگلی صبح میں ان لوگوں کے ساتھ ان کے بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ اپنی چالیس سالہ زندگی میں مَیں نے بڑے بڑے بادشاہ اور ان کے محلات دیکھے لیکن اس بادشاہ کے محل کی شان و شوکت دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ایسا بلند و بالا اور اتنی قیمتی آرائشوں سے سجا ہوا محل میں نے زندگی میں نہ دیکھا تھا۔ بادشاہ خود بھی بہت رحم دل اور نیک نفس تھا۔ اس نے میری ساری رام کہانی سنی اور حکم دیا کہ مجھے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے اور میری خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ کی جائے۔ چناں چہ ایک فوجی افسر کو میری خدمت پر مقرر کر دیا گیا اور میں شاہی مہمان خانے میں بڑے آرام سے رہنے لگا۔ روزانہ ایک مخصوص وقت پر میں نے دربار میں حاضری دینی ہوتی، باقی وقت میں شہر کی سیاحت میں گزارتا تھا۔

جس شہر میں مَیں اس وقت موجود تھا، اسے سراندیپ کہتے ہیں۔

یہ شہر دراصل ایک بہت بڑے پہاڑ کی جزیرہ نما وادی ہے۔ اسی پہاڑ کی ایک کھوہ سے وہ دریا نکلتا ہے جس کے کنارے پر ان لوگوں کو بے ہوش پڑا ملا تھا۔ یہ پہاڑ اتنا بلند ہے کہ سمندر میں دو تین دن کی دُوری سے نظر آتا ہے۔

سراندیپ کا شہر اور اس کے اردگرد کے جزیرے خطِ استوا کے عین نیچے واقع ہیں۔ یہاں پر سورج بالکل سیدھا چمکتا ہے۔ شام کو روزانہ بارش ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہریالی بہت ہے۔ میں جن دنوں وہاں تھا، ہر طرف خوشی اور خوش حالی کا راج تھا۔ لوگ بڑے چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ لوگ خوش خوراک بھی تھے اور خوش لباس بھی۔ میں نے بھی ان میں بڑا اچھا وقت گزارا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے اپنے وطن کی یاد آنے لگی۔ آخر ایک دن میں نے بادشاہ سے عرض کی کہ واپسی کی اجازت دے دی جائے۔ بادشاہ نے میری درخواست کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا اور بغداد کے خلیفہ کے نام ایک خط دیا، جس میں اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا گیا تھا۔ مجھے یہ ہدایت کی گئی کہ اس خط کو پوری ذمہ داری سے خلیفہ کی خدمت میں پہنچاؤں۔

اس کے بعد مجھے بڑے عزت اور احترام سے سراندیپ سے رخصت کیا گیا۔ بندرگاہ پر ایک فوجی دستہ مجھے سلامی دینے آیا اور بڑے اعزاز سے مجھے جہاز میں سوار کرایا گیا۔

میں ان لوگوں کی اچھی یاد ہی دل میں لیے ہوئے منزلوں پہ منزلیں مارتا ہوا بغداد پہنچا۔ پہلا کام یہ کیا کہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر شاہِ سراندیپ کا خط اور تحائف پہنچائے۔

اس زمانہ میں اس عجیب و غریب اور دُور دراز ملک کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ بہت سارے تو اس کا نام سن کر حیران ہوئے اور بہت سے جہاز ران مجھ سے وہاں تک پہنچنے کا راستہ دریافت کرنے لگے۔ اس طرح میں چند دن میں ہی سارے بغداد میں مشہور ہو گیا۔

اس سفر میں نہ میرا تجارتی سامان بچا اور نہ میں نے تجارت کی بلکہ جب میں واپس بغداد آیا تو میرے پاس شاہِ سراندیپ کے دیئے ہوئے تحفوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میرا سفر اس اعتبار سے حیرت انگیز تھا کہ اس سے مجھے بہت شہرت ملی۔ اب حال یہ تھا کہ امیروں وزیروں کے علاوہ عام لوگ بھی یہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں، گپ شپ کروں اور انہیں اس دیوقامت پہاڑ کے بارے میں بتاؤں جو سمندر کے درمیان میں واقع ہے۔ چناں چہ میں نے ان میں سے اکثر کی دعوت کو قبول کیا اور خوب دل کھول کر سفر کی تفصیلات بیان کیں۔ شاید اسی کا یہ اثر تھا کہ بعد میں بغداد کے کئی تاجروں نے مجھے اس بات کی پیش کش کی کہ میں ان کے ساتھ تجارت میں حصے دار بن جاؤں۔ میں نے ان تجویزوں کو بھی قبول کیا اور یوں ان حصے داریوں کی وجہ سے مجھے گھر بیٹھے منافع ملنے لگا۔

بعد میں مَیں اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ پچھلے سفروں میں مشقت زیادہ ہوتی تھی اور دولت کم ملتی تھی لیکن اسی سفر میں مشقت کم ہوئی اور دولت زیادہ ملی۔

☆☆☆

میرا پہلا پڑاؤ چلاس تھا۔ چلاس کا شہر شاہراہ ریشم سے خاصی بلندی پر ہے۔ چاندنی ہوٹل میں جب مسافر ناشتا کر رہے تھے، میں نے ہوٹل والے سے بات کی جس نے ایک نوعمر لڑکے کو جگایا جو کرائے پر سوزوکی چلاتا تھا۔ بیس روپے کے عوض وہ مجھے لے جانے پر آمادہ ہوا۔

سوزوکی نے رُخ پھیرا۔ ذرا فاصلے پر شنگریلا تھا۔ ائر مارشل اصغر خان کے چھوٹے بھائی بریگیڈیئر اسلم کا شنگریلا ہوٹل۔ شمالی علاقہ جات میں ان مہنگے شنگریلا ہوٹلوں نے دھوم مچا رکھی ہے۔ خاص طور پر شنگریلا بلتستان نے۔

دفعتاً میں نے اپنے دائیں ہاتھ دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کنچن چنگا سورج کی اوّلین کرنوں میں ہنستی ہو اور کہتی ہو کہ خواہشیں اور آرزوئیں اگر سچی طلب رکھتی ہیں تو کسی نہ کسی روپ میں ضرور پوری ہوتی ہیں۔

میں نے ڈرائیور لڑکے کی طرف دیکھا۔

اس نے میری آنکھوں سے چھلکتے سوال کا مفہوم سمجھا اور بولا۔

"یہ نانگا پربت ہے۔ استور اور چلاس کا درمیانی پہاڑ۔ دُنیا کی چھٹی اُونچی چوٹی جس کی بلندی 8126 میٹر ہے۔"

میں سوزوکی سے نیچے اُتر آئی تھی۔

ڈرائیور لڑکا بولے جا رہا تھا۔ میرے کان بند ہو گئے تھے۔ ہونٹ سل گئے تھے۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اس وقت چلاس کے پہاڑوں سے ٹکرا کر جو ہوائیں لوٹتی تھیں وہ تیز بھی تھیں اور گرم بھی۔ نانگا پربت کی برف کے پیرہن پہنے چوٹیاں جن پر سورج کی طلائی کرنیں کیسے کیسے دلفریب نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ مجھ پر جذب کی گہری کیفیت طاری تھی۔ جی چاہتا تھا وجود کی قید سے آزاد ہو کر ان کے سینے پر چڑھ دوڑوں۔ حسن فطرت کی شراب اس فیاضی سے بہہ رہی تھی کہ میری آنکھیں پی پی کر سیراب ہونے کی بجائے مزید پیاسی ہو رہی تھیں۔

میں نے نگاہوں کا رُخ پھیرا۔ آسمان کی نیلی وسعتوں سے زمین کی خاکستری پہنائیوں میں آئی سونیوال کوٹ کی بستی شاہ بلوط کے جھومتے سبز درختوں کے درمیان کھڑی تھی۔ دُوربین کی آنکھیں مجھے چھوٹی چھوٹی تفصیلات سنانے لگی تھیں۔ مثلاً گھروں کے آنگن سُونے تھے۔ خاصی گنجان وادی تھی لیکن زندگی کی جیتی جاگتی علامت دھواں تین چار گھروں کے سوا کہیں سے نہیں اُٹھ رہا تھا۔ ڈھور ڈنگر بھی نظر نہیں آتے تھے اور انسان بھی کم و بیش نظروں کی زد سے باہر تھے۔ چند بوڑھوں نے ضرور اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ گلیوں اور گھروں میں اُچھلتے ناچتے بچوں کی عدم موجودگی تشویش ناک تھی۔

میں نے لڑکے سے اس ویرانی کا سبب پوچھا۔

پتا چلا کہ چلاس چونکہ سارے شمالی علاقوں میں سب سے زیادہ گرم ہے۔ گرمیاں شروع ہوتے ہی یہاں کے لوگ ٹھنڈی جگہوں پر چلے جاتے ہیں۔ یہ بستی جو اب شاہین آباد کہلاتی ہے، موسم گرما کے آغاز میں ہی گئی داس اور نیاٹ کے نالوں میں چلی گئی ہے۔

بات سمجھ میں آجائے تو سر کا ہلنا فطری امر ہے۔ میں بھی ہلتے سر کے ساتھ آکر سوزوکی میں بیٹھ گئی۔

لڑکے نے سوزوکی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

نانگا پربت کو مقامی لوگ دیامر کہتے ہیں۔ ہماری زبان میں اس کے معنی ہیں پریوں کے رہنے کی جگہ۔ یہ بات مشہور ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر پریاں رہتی ہیں۔ اب لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ سب غلط باتیں ہیں۔

میں نے نانگا پربت کے حسن کو پھر دیکھا اور لڑکے سے کہا۔

''ارے غلط کیوں ہیں؟ حسن و رعنائی کے خیالی یا حقیقی پیکر ایسی دل آویز جگہوں پر نہ رہیں گے تو کیا پنڈی بھٹیاں کے چک نمبر 88 کی روڑیوں پہ ڈیرے ڈالیں گے۔''

لڑکا کھلکھلا کر ہنسا۔ بات شاید اس کے دل کو لگی تھی۔

میرے سامنے بٹوگاہ کے کنارے واقع ایک اور آبادی تھی۔ چلاس بازار تھوڑا سا اونچائی پر ہے۔ بٹوگاہ چلاس کا مشہور نالہ ہے۔ چلاس کے اکثریتی قبیلے بٹو کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ اکثریت شین ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تاریخ کی قدیم ترین بستی ہے۔ بٹوکوٹ کی بستی بھی ویران نظر آرہی تھی۔ لڑکا بتا رہا تھا کہ بیشتر لوگ اس مال مویشیوں کے ساتھ بٹوگاہ کی چراگاہوں میں چلے گئے ہیں۔ وہیں مکئی کی فصل کاٹ کر اکتوبر میں واپس آئیں گے۔

اللہ! اب میں ساری جان سے لرزی تھی۔ یہاں تو بستیاں ویران پڑی ہیں۔ جن کی مہمان بننے جا رہی ہوں وہ بھی اگر ٹھنڈی ہوائیں کھانے اپنے گرمائی مستقر گئے ہوئے ہوں تو میرا کیا بنے گا؟ بہرحال دل کو سمجھایا کہ اب گھبرانا کیسا؟ اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں سے کیا ڈر؟ چلاس کا بازار آیا۔ اونچے اونچے موڑ آئے۔ ٹیڑھی میڑھی گلیاں۔ چھوٹی سی عمر کا لڑکا کس مہارت سے گاڑی چلاتا تھا۔ ہر موڑ پر میرا دل ڈوب جاتا کہ بس اب گاڑی الٹی کہ الٹی لیکن خیریت رہی اور اسپتال روڈ کے عین مقابل ایک کھلے سے میدان میں اس نے مجھے اتارتے ہوئے کہا۔

''لیجیے وہ سامنے آپ کے میزبانوں کا گھر ہے۔''

ابھی میں نے زمین پر قدم رکھ کر چلاس کی ہوا کا ناک کے نتھنوں سے ایک زوردار کش لیا ہی تھا کہ میرے دائیں بائیں بچوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ چمکتے دمکتے چہروں والی چھوٹی بچیاں جنہوں نے ایرانی جرسی کے سبز اور سرخ پھولوں والے نیلے پیلے سوٹ پہن رکھے تھے، اوڑھنیاں سروں پر تھیں اور بالوں کا رنگ واضح نہیں ہو رہا تھا۔ سرخ و سفید چہروں پر زکام کے پیلے لیس دار مادے سے لتھڑی ناکوں والے لڑکے جن کے نقش و نگار ان خدوخال سے مختلف تھے جن کے بارے میں میں نے پڑھا اور سنا تھا۔

اپنے اردگرد اس پُر رونق میلے کو دیکھ کر مجھے خوشی کا احساس ہوا تھا۔ دل کو ڈھارس بندھی کہ چلو کچھ لوگ تو ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا تھا کہ بہت سے سرکاری ملازمین اور کاروباری گھرانے ابھی یہیں ہیں۔

تبھی میرے میزبان آنکھوں میں حیرت و استعجاب کے رنگ لیے میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے ڈاکٹر ناموس کی کتاب کا ایک خالص شین چہرہ کتابی صفحات سے نکل کر میرے سامنے آگیا ہو۔ چھوٹی قامت، کھڑی ناک پر ذرا عمودی، موٹی آنکھوں کی رنگت اودے اور نیلے رنگ کے بین بین، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں لیکن گال پچکے ہوئے۔ چہرہ سرخ و سفید اور باریش۔

انہیں شاید کسی نے اطلاع دے دی تھی۔ میں نے اپنا تعارف اپنے چچا کے حوالے سے کروایا۔ بہت خوش ہوئے۔

ان کے پیچھے پیچھے چلتی گھر میں داخل ہوئی۔ گزرگاہ کے ساتھ مردانہ بیٹھک جس کا دروازہ صاحب خانہ نے کھولا تو لکڑی کی چھت کھڑکیوں اور دروازوں کے ساتھ فرش بھی چوبی نظر آیا۔ چلاس کی وادیاں داریل اور تانگیر جنگلات کا گھر ہیں۔ مکان میں لکڑی کا استعمال فراخدلی سے ہوتا ہے۔ نشست گاہ آنگن سے تین زینے نیچی تھی۔ صحن کے ایک طرف بادام کا درخت کچے پھل کے ساتھ پر پھیلائے کھڑا تھا۔ دوسری طرف کائل کی لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ آنگن سے ذرا اونچا برآمدہ اور آگے دو کمرے جن پر کسی اجڑی بیوہ کا گمان پڑتا تھا۔ ہاں، البتہ لٹکتی بیش قیمت بندوقیں چلاسی لوگوں کی جنگجویانہ ذہنیت کی عکاس تھیں۔

(باقی آئندہ)

بلا عنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 / مئی 2015ء ہے۔
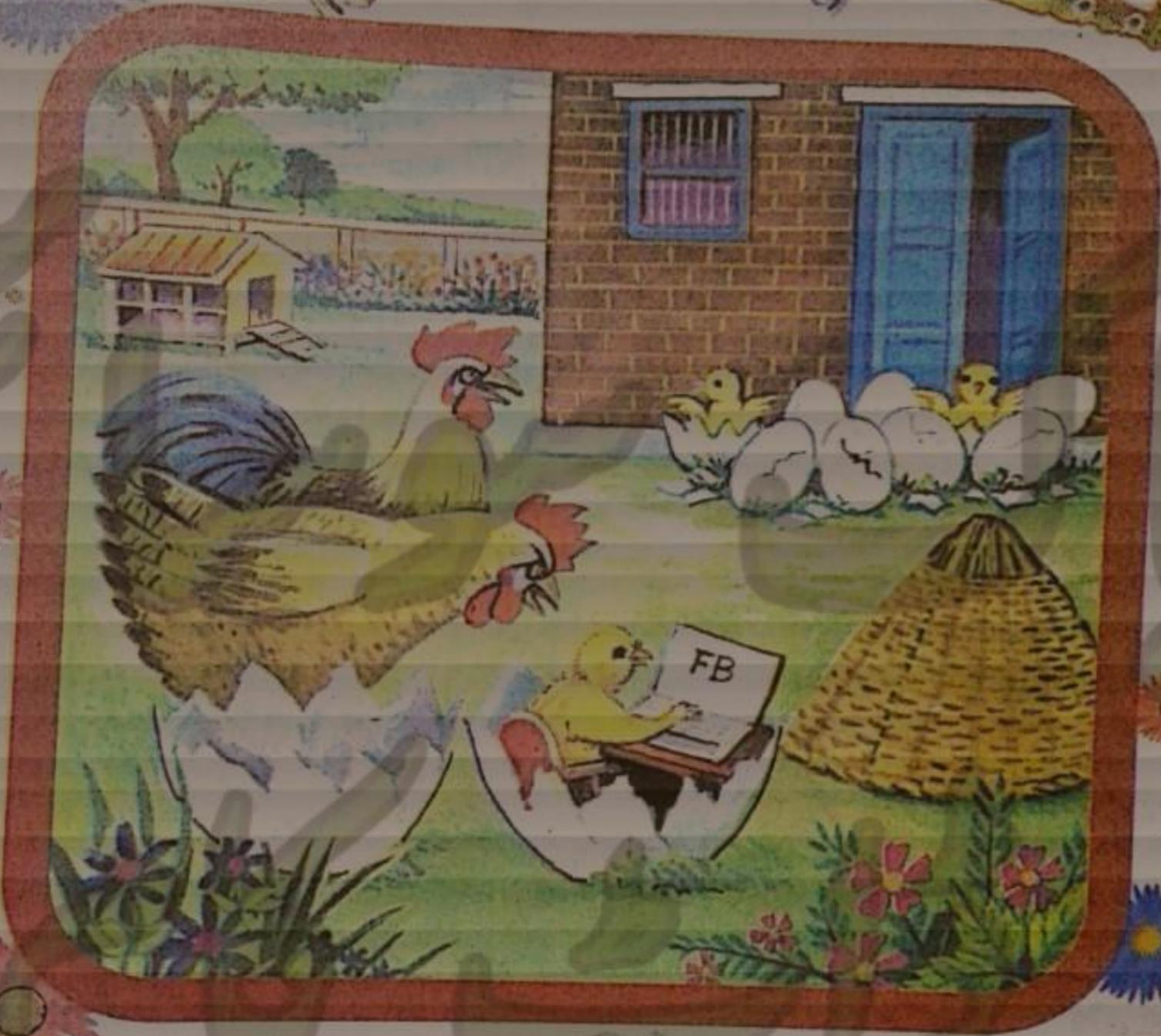
اپریل 2015ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- بھینس کے آگے بین بجانے کی بجائے بھینس کے کانوں میں گانا بجانا (ثناء احمد، خانیوال)
- میوزک نے کیا مست حال اب جتنا چاہے دودھ نکال (ھدیٰ کامران، لاہور)
- ہو گیا فیشن پُرانا بھینس کے آگے بین بجانا (عاطف ممتاز، چکوال)
- جنگل میں منگل کا سماں دکھتا ہے (حافظ ثناء عروج، فیصل آباد)
- یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے (ارفع، عائشہ اختر، راول پنڈی)

ننھے مصور

میلہ چراغاں

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

محمد زبیر جمشید، خانیوال (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

سیدہ تحریم مختار، لاہور (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

لائبہ عرفان، کراچی (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

عائشہ ظفر، رحیم یار خان (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

عنبر امتیاز، راول پنڈی کینٹ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: نور العین، رسالپور۔ عبداللہ زاہد، فیصل آباد۔ ثمرہ غفار، رحیم یار خاں۔ محمد خان، خانیوال۔ عائشہ وحید، بہاول پور۔ زوبیہ احمد، کراچی۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ حمزہ عبدالرزاق، اوکاڑہ۔ نادیہ بشیر، عشاء نور، عبداللہ بشیر، حسن بشیر، سیال کوٹ۔ زینب حسین، کراچی۔ کشف طارق، لاہور۔ رضوان مصطفیٰ، اوکاڑہ۔ بشریٰ ناز، زل رانا، احور کامران، کنظیمہ زہرہ، لاہور۔ محمد احمد کامران، شاہ علی، توفیق احمد، ملتان۔ سجاد حیدر، گجرات۔ زوہیب خان، عقل ہما، نازش طفیل، صدیقہ عائشہ، کوئٹہ۔ عاصمہ اکمل، پشاور۔ ہنین ظلال، کراچی۔ عیشہ، اسلام آباد۔ ضحویٰ، راول پنڈی۔ سبرینہ خان، گوجرانوالہ۔ سندس اویس، کراچی۔ طلحہ اعجاز، ملتان۔ صادقہ قریشی، قلعہ گوجر سنگھ۔ سعود الحسن، سمندری۔ صاعقہ، لاہور۔ سعدیہ عثمان، پشاور۔ نورین احمد، حیدر آباد۔ جاوید اختر، سیال کوٹ۔ عبدالغفار غفور، حیدر آباد۔ جلال خان، پشاور۔

مئی کا موضوع
ریلوے اسٹیشن

آخری تاریخ 8 مئی

جون کا موضوع
افطاری کا وقت

آخری تاریخ 8 جون

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔